معارف کا زرِ تعاون

ہندوستان میں سالانہ ساٹھ روپے فی شمارہ پانچ روپے

پاکستان میں سالانہ ایک سو پچاس روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ہوائی ڈاک پندرہ پونڈ یا چوبیس ڈالر

بحری ڈاک پانچ پونڈ یا آٹھ ڈالر

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:۔ حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ

بالمقابل ایس ایم کالج۔ اسٹریچن روڈ۔ کر

• سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں، بینک ڈرافٹ درج ذ

نام سے بنوائیں:

ARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY AZAMGARH

• رسالہ ہر ماہ کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے، اگر کسی مہینہ کے آخر تک رسالہ نہ پہونچے تو اس کی

اطلاع اگلے ماہ کے پہلے ہفتہ کے اندر دفتر معارف میں ضرور پہونچ جانی چاہیے، اس کے

رسالہ بھیجنا ممکن نہ ہوگا۔

• خط و کتابت کرتے وقت رسالے کے لفافے کے اوپر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور د

• معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔

کمیشن ۲۵٪ ہوگا ——— رقم پیشگی آنی چاہیے۔

جلد ۱۵۰ ماہ صفر المظفر ۱۴۱۳ھ مطابق اگست ۱۹۹۲ء عدد ۲

مضامین

مقالات

آثارِ علمیہ و ادبیہ

ضروری تصحیح

معارف ماہ جون و جولائی ۱۹۹۲ء میں جلدوں کے ہندسے غلط لکھ گئے ہیں۔ انھیں بالترتیب ۱۴۹ اور ۱۵۰ کر لیا جائے۔ اور جولائی کے شمارہ پر انگریزی میں ہندسہ (7) کے بجائے (1) کر لیں۔

"منیجر"

شذرات

آزادی کے بعد ہی سے بابری مسجد پر غاصبانہ قبضہ کے لیے وقفہ وقفہ سے اجودھیا میں ناٹک ہو رہا ہے۔ ناٹک کرنے والے اپنا کرتب اس طرح دکھانا چاہتے ہیں کہ چت بھی اپنی پٹ بھی اپنی۔ اس کے لیے کبھی وہ واقعات وحقائق کو توڑ مروڑ کر دنیا کی آنکھ میں دھول جھونکنا چاہتے ہیں، کبھی متضاد اور الٹے سیدھے بیانات دیتے ہیں اور سچ کو جھوٹ اور جھوٹ کو سچ ثابت کرتے ہیں، جس کے جو جی میں آتا ہے وہی راگ الاپتا ہے۔ چاہے اس میں کوئی معقولیت اور حقیقت پسندی ہو یا نہ ہو۔ غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں۔ اس سے مطلب نہیں کہ ان کا کوئی اور چھور بھی ہے یا نہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ کٹ حجتی، دھاندلی، دھوکہ فریب، مکر، چالبازی اور زور زبردستی سے خانۂ خدا کو صنم خانہ اور حرم کو دیر بنا دیں لیکن یہ اداکاری اور کرتب بازی انھی کی رسوائی اور بدنامی کا سامان نہیں ہے بلکہ ملک و وطن کی تباہی و بربادی کا پیش خیمہ بھی ہے۔

اجودھیا میں ہونے والے ناٹک کا پہلا پارٹ ۲۲ ر ۲۳ دسمبر ۴۹ء کی درمیانی رات میں ہوا۔ جب دیوار پھاند کر چوری سے مسجد کے اندر مورتی رکھ دی گئی اور کہا گیا کہ زمین پھاڑ کر رام للا نکل پڑے۔ اس کے بعد مسجد میں تالا پڑ گیا اور مسلمانوں کا داخلہ اس میں بند کر دیا گیا۔ دوسرا پارٹ ۸۶ء میں ہوا جس کے بعد مسجد کا تالا کھلوا کر اسے پوجا پاٹ کیلئے ہندوؤں کے حوالہ کر دیا گیا۔ ۹ ر نومبر ۸۹ء کو ہونے والے تیسرے پارٹ میں بابری مسجد کی زمین گنج شہیداں پر شیلانیاس کرایا گیا۔ ملک بھر میں رتھ یاترا بھی اسی ناٹک کا ایک خاص پارٹ ہے۔ اس سال ہونے والے ناٹک میں پہلے اجودھیا کی زمین اکوائر کر کے چار مندروں کو زمیں دوز کیا گیا اور آخری مرحلہ میں ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے فیصلے کے علی الرغم ۹ ر سے ۲۶ ر جولائی تک شیلانیاس کی متنازعہ زمین پر پختہ چبوترہ تعمیر کر دیا گیا۔ ریاستی حکومت تو شروع ہی سے مندر کی

تعمیر میں حائل رکاوٹیں دور کر رہی ہے۔ مگر مرکزی حکومت بھی عدالتی آرڈر کو نافذ کرنے کی جرأت وہمت نہیں کر سکی۔ اگر یہی لیل ونہار رہے تو ناٹک کے دو ایک اور پارٹ کے بعد یہ قصہ ہی ختم ہو جائے گا اور بابری مسجد رام جنم بھومی میں تبدیل ہو جائے گی۔

اس ناٹک کے جو اداکار سامنے ہیں وہ تو سب کو دکھائی دیتے ہیں لیکن جو پردے کے پیچھے ہیں اور اپنے چہرے پر جمہوریت اور سیکولرازم کا نقاب ڈال کر رات دن حق وانصاف کی دہائی دیتے ہیں، عدالت کے وقار واحترام اور دستور وآئین کی برتری اور بالادستی کا دم بھرتے ہیں اور برابر اس کی سوگند کھاتے ہیں کہ بابری مسجد کو کوئی نقصان نہیں پہونچنے دیں گے، ممکن ہے ان کو پہچاننے میں عام لوگوں کو دشواری ہو۔ لیکن اہل نظر انھیں بھی خوب جان پہچان گئے ہیں کہا جاتا ہے کہ اجودھیا ایک انتہائی نازک اور سنگین مسئلہ ہو گیا ہے۔ لیکن اسے اس حد تک پہونچانے کی ذمہ داری کس کی ہے۔ کس نے فرقہ پرستوں کو کھلی چھوٹ دے رکھی تھی کہ وہ قانون کو پامال کریں اور عدالت کی توہین کریں۔ وزیر اعظم کی عاجزانہ درخواست اسی وقت انھوں نے منظور کی جب چبوترہ کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ ابھی وزیر اعظم کے تدبر اور فتح عظیم کی داد ہی دی جا رہی تھی کہ باہمی گفت وشنید کے بارے میں ان کا اور سادھو سنتوں کا اختلاف شروع ہو گیا۔ پھر بھی یہ خوش فہمی ہے کہ تین چار ماہ میں یہ پیچیدہ مسئلہ حل ہو جائے گا ؎

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید   جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

رام اور مندر کے نام پر تشدد، خوں ریزی اور ظلم و ناانصافی کا جو طوفان اٹھا ہے، وہ پورے ملک کو غارت اور تباہ کر کے چھوڑے گا۔ اس وقت ملک اخلاقی، تہذیبی اور معاشی بحران میں مبتلا ہے لیکن دیش بھگتوں کو مسجد مندر کے جھگڑے سے فرصت نہیں۔ وہ سنگین خطروں اور نازک مسائل سے گھرا ہوا ہے لیکن مذہبی جنون کے جوش میں ان پر توجہ دینے کا موقع کس کو ہے۔ مسلمان اجودھیا کی فتنہ سامانی سے بڑی حد تک الگ تھلگ ہو گئے ہیں اور انھوں نے

خانۂ خدا کا معاملہ اسی کے حوالہ کر دیا ہے کہ وہ چاہے گا تو مسجد محفوظ رہے گی۔ اس دفعہ اتنے سخت مرحلے میں بھی وہ صبر و ضبط کا پیکر بنے رہے۔ اور ان کے لیڈروں نے بھی کسی قسم کی نفرت، اشتعال اور طیش کی بات نہیں کہی۔ دراصل انھوں نے پچھلے واقعات سے یہ سبق سیکھا ہے کہ اگر ان کی رگِ حمیت ذرا بھی پھڑکی تو انھیں اس کا سخت خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ مگر اس احتیاط کے باوجود مالیگاؤں، کیرالا اور بعض دوسرے مقامات میں ان کی جان و مال کا اتلاف ہو کر رہا۔ یہ اس ملک کی جمہوریت کا کرشمہ ہے کہ آئین، دستور اور عدالت کو چیلنج کرنے والے اور مذہبی منافرت پھیلانے والے تو دندناتے پھر رہے ہیں لیکن دوسری طرف ان کی چنگیزیت اور ظلم آرائی کے خلاف لب کشائی بھی جرم بن جاتی ہے۔ اور ع بات پر واں زبان کٹتی ہے۔

عدالت عالیہ کے حکم کے باوجود دھوم دھام سے کارسیوا ہوتی رہی اور ریاستی اور مرکزی حکومتیں عدالتی فیصلے کو نافذ کرنے میں بے بس اور مجبور بنی رہیں۔ قانون اور دستور کے باغی اب بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نہ عدالت کا فیصلہ مانیں گے نہ مسجد سے مورتی ہٹائیں گے بلکہ مسجد ہی پر مندر تعمیر کریں گے۔ یہ سب مسلمانوں کیلئے مایوس کن اور جمہوریت پر اعتماد متزلزل کر دینے والی باتیں ضرور ہیں لیکن دوسری جانب ان کے لیے یہ امید افزا اور خوش آیند پہلو بھی ہے کہ ملک کی تمام انصاف اور ترقی پسند جماعتیں بابری مسجد کے تحفظ کی بات شد و مد سے کرنے لگی ہیں۔ دراصل اب یہ تنہا مسلمانوں کا مسئلہ نہیں رہا بلکہ ملک کے آئین و دستور، جمہوری قدروں اور ملک کی سالمیت کے تحفظ کا مسئلہ ہو گیا ہے۔ بابری مسجد کے بقا پر سیکولرازم اور جمہوریت کے بقا کا انحصار ہو گیا ہے۔ خود کانگریس کا رویہ اب تک جو بھی رہا ہو، لیکن اس کے لیے سیکولر نقطۂ نظر سے انحراف کرنا مشکل ہو رہا ہے۔ اس میں ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو ووٹ کی سیاست سے بالاتر ہو کر مسائل پر غور کرتا ہے۔ رام اور لچھمن کی اس دھرتی اتر پردیش میں ایسے ویر اور جیالے موجود ہیں جو بابری مسجد کی حفاظت کیلئے تن تنہا سینہ تان کر کھڑے ہو گئے تھے۔ اس طرح سیاسی پارٹیوں میں صرف بی جے پی ہی رہ گئی ہے۔ گو اس کیلئے بھی مسجد کو نگل جانا مشکل ہو رہا ہے۔ مگر مرکزی حکومت پر قبضہ کیلئے وہ اکیلے ہی [illegible] شیخ تنہا کس طرف۔

مقالات

بارہویں صدی ہجری کے دو اودھی مفسرین

از محمد عارف اعظمی عمری

صوبہ اودھ ہر دور میں علم و فضل، درس و تدریس، تصنیف و تالیف اور صوفیانہ سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ پیش نظر مقالہ میں بارہویں صدی ہجری کے دو ممتاز علما کے خیالات اور کارنامے پیش کیے جاتے ہیں، ان دونوں میں تفسیر کا ذوق مشترک تھا۔ پہلے بزرگ مولانا شیخ غلام نقش بند گھوسوی لکھنوی ہیں اور دوسرے شیخ علی اصغر قنوجی۔

مولانا شیخ غلام نقشبندؒ گھوسوی لکھنوی

شیخ غلام نقش بندؒ عہد مغلیہ کے یگانۂ روزگار عالم اور شریعت و طریقت کے جامع بزرگ تھے، یہ موجودہ ضلع مئو کے مردم خیز قصبہ گھوسی میں پیدا ہوئے، جس کو اس عہد میں دیار پورب میں یک گونہ علمی برتری حاصل تھی۔ شیخ غلام نقشبند بچپن ہی میں گھوسی سے اپنے والد کے ہمراہ لکھنؤ چلے آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے، اس لیے وہ لکھنوی بھی کہلاتے ہیں، ان کی اہمیت اس سے ظاہر ہے کہ ملا نظام الدین سہالوی جیسے فاضل اجل ان کے تلمیذ خاص تھے جو برصغیر کے موجودہ نصاب و نظام تعلیم کے بانی ہیں۔

نام و نسب اور خاندانی حالات | غلام نقش بند نام اور والد کا نام عطاء اللہ تھا۔

سلسلۂ نسب یوں ہے۔

غلام نقش بند بن عطاء اللہ بن قاضی حبیب اللہ بن احمد بن ضیاء الدین بن یحییٰ بن شرف الدین بن نصیر الدین بن حسین عثمانی اصفہانی[1]

اس نسب نامہ سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا خاندانی تعلق امیر المومنین حضرت عثمانؓ بن عفانؓ کے خاندان سے تھا غالباً شیخ کا خاندان پہلے سرزمین حجاز سے نکل کر اصفہان میں آباد ہوا، پھر وہاں سے کوئی بزرگ ہندوستان وارد ہوئے ہوں گے، لیکن تذکرہ کی کتابوں میں اس کی کوئی صراحت موجود نہیں ہے۔ شیخ غلام نقش بند کے دادا قاضی حبیب اللہ ایک باکمال بزرگ اور فقہ افتا کے ماہر تھے، اپنی اسی خصوصیت کی بنا پر وہ قصبہ گھوسی کے قاضی مقرر کیے گئے تھے اور اس منصب پر مدۃ العمر فائز رہے[2] قاضی حبیب اللہ شیخ علی بن قوام جونپوری مشہور بہ میر علی عاشقاں سرائے میری سے بیعت تھے۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی جن کے نانا میر عبدالجلیل بلگرامی شیخ غلام نقش بندؒ کے ارشد تلامذہ میں تھے[3] تحریر فرماتے ہیں:

آبائے کرام آں جناب متوطن	شیخ غلام نقش بند کے آباء واجداد
قصبہ گھوسی تابع بلدۂ جونپور	قصبہ گھوسی کے رہنے والے تھے جو
واز عظمائے آں مکاں اند[4]	(اس عہد میں) سرکار جونپور کے
	ماتحت تھا ان کے خاندان کے
	لوگوں کا شمار وہاں کے شرفاء

۱ نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۲۱۲ ۲ ایضاً جلد ۴ ص ۸۵ ۳ مآثر الکرام جلد اول ص ۲۵۸-۲۵۹ ۴ ایضاً جلد اول ص ۲۱۳۔

میں ہوتا تھا۔

آزاد کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ غلام نقشبندؒ کا خاندان عرصہ سے گھوسی میں آباد تھا اور اسے اس علاقے میں بڑی قدر و منزلت اور عزت و شہرت حاصل تھی۔

شیخ غلام نقشبندؒ کے والد شیخ عطاء اللہ بھی اپنے والد قاضی حبیب اللہ کی طرح صاحب نسبت بزرگ اور عالم و فاضل شخص تھے۔ وہ گھوسی میں پیدا ہوئے اور اس نواح کے جہابذہ علما سے اکتساب فیض کیا، قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنی تمام عمر درس و تدریس میں گزاری، ان کے مشہور شاگرد میر محمد شفیع دہلوی تھے، جن کی آغوش میں خود ان کے فرزند ارجمند شیخ غلام نقشبندؒ کی تعلیم و تربیت ہوئی تھی[1] اخیر عمر میں وہ لکھنؤ جا کر آباد ہو گئے تھے، جہاں ۵ ربیع الثانی ۱۰۶۳ھ کو انکی وفات ہوئی[2]

پیدائش شیخ غلام نقشبندؒ ۱۹ ذی الحجہ ۱۰۵۱ھ کو قصبہ گھوسی میں پیدا ہوئے[3] گویا اس وقت تک ان کے والد گھوسی ہی میں مقیم تھے، شیخ عطاء اللہ نے حضرت بہاء الدین نقشبندؒ کے نام نامی کی نسبت سے ان کا نام غلام نقشبند رکھا[4]

تعلیم و تربیت میر غلام علی آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق شیخ غلام نقشبندؒ کی تعلیم شروع سے اخیر تک میر محمد شفیع کے دامن فضل و کمال میں ہوئی، جو دہلی میں مقیم تھے[5] ممکن ہے شیخ عطاء اللہ نے نہایت کم سنی ہی میں انہیں تعلیم کے لیے دہلی بھیج

۱ مآثر الکرام جلد اول ص ۲۱۳ ۲ نزہۃ الخواطر جلد ۵ ص ۲۷۴ ۳ ایضاً جلد ۶ ص ۲۱۳ ۴ مآثر الکرام جلد اول ص ۲۱۳ ۵ ایضاً۔

دیا ہو یا ۱۰۶۳ھ میں اپنے والد کی وفات کے بعد انھوں نے دہلی کا سفر کیا ہو۔ جب وہ بارہ سال کے تھے، غرض میر محمد شفیع کے سایۂ عاطفت میں اٹھارہ سال کی عمر ہی میں انھوں نے جملہ علوم و فنون میں کمال حاصل کر لیا تھا[1] اس کے بعد اپنے استاد کے شیخ پیر محمد لکھنوی سے تبرکاً کچھ علوم پڑھ کر سند فضیلت حاصل کی، اس وقت ان کی عمر اکیس سال تھی[2] صاحب نزہۃ الخواطر کا بیان ہے کہ پیر محمد لکھنوی سے انھوں نے شرح چغمینی، قدوری اور تفسیر بیضاوی کے چند اجزاء پڑھے تھے[3]

علمی تبحر | شیخ غلام نقشبندؒ دینی علوم کی طرح علوم آلیہ عقلیہ کے بھی ماہر تھے، صاحب نزہۃ الخواطر کا بیان ہے:۔

کان من کبار الاساتذۃ لم	وہ کبار اساتذہ میں شمار ہوتے تھے
یکن فی زمانہ اعلم منہ بالنحو	ان کے زمانے میں نحو، لغت، اشعار
واللغۃ والاشعار وایام	ایام عرب اور ان کے متعلقات کا
العرب وما یتعلق بہا	ان سے بڑھ کر کوئی عالم نہ تھا مزید
متوفرا علی علوم الحکمۃ[4]	برآں وہ علوم حکمت سے بھی بہرہ ور تھے،

سلوک و معرفت | تذکرہ نگاروں نے سلوک و عرفان میں بھی انہیں ممتاز بتایا ہے، سبحۃ المرجان میں ہے۔

ھو اوحد الزمان والجامع	وہ یکتائے زمانہ اور علم و عرفان کے

[1] ماثر الکرام جلد اول ص ۲۱۳ [2] ایضاً [3] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۲۱۳
[4] ایضاً ص ۲۱۲۔

بین العلم والعرفان[1]	جامع تھے۔

ماثر الکرام میں اس کی تفصیل یوں کی گئی ہے۔

علامہ ایست جامع عجائب و	وہ ایسے جلیل القدر عالم ہیں جو علوم
غرائب علوم و خدا رسی است	عجائب و غرائب کے ساتھ ہی خدارسی
خازن اسرار معلوم و مکتوم[2]	کے بھی جامع اور معلوم اور پوشیدہ
	اسرار کے خازن ہیں۔

خود شیخ غلام نقشبندؒ کا بیان ہے کہ زمانۂ طالبعلمی کے آغاز میں ایک شب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ اپنے دست مبارک سے میرے سامنے کے بٹن کھول رہے ہیں اور اسی حالتِ خواب میں یہ تعبیر بھی القا ہوئی کہ آپؐ مجھ پہ علم کے دروازے کھول رہے اور شرح صدر فرما رہے ہیں[3]

سجادہ نشینی | شیخ غلام نقشبندؒ اپنی خداداد لیاقت اور صلاحیت کی بنا پہ اپنے استاد میر محمد شفیع کی موجودگی میں ان کے استاد اور پیر و مرشد شیخ پیر محمد لکھنوی کی مسند پہ متمکن کیے گئے جس کے بعد ان کا فیض بہت عام ہوا، آزاد بلگرامی لکھتے ہیں:۔

"شیخ پیر محمد کی وفات (۱۰۸۵ھ) کے بعد ان کے تمام خلفاء اور مریدین نے متفقہ طور پہ یہ طے کیا کہ میر محمد شفیع کو جو ان کے اجل خلفاء میں تھے ان کا جانشین منتخب کیا جائے، وہ اس وقت دہلی میں تھے اس لیے انکے لکھنؤ آجانے تک انھوں نے مسند کو تہہ کرکے رکھا جب پیر محمد شفیع لکھنؤ پہونچے تو ان کے دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ وہ اپنے بجائے اپنے شاگرد رشید شیخ غلام نقشبندؒ کو اپنے استاذ کا جانشین مقرر کر دیں،

[1] سبحۃ المرجان ج اول ص ۲۰۱ مطبوعہ علی گڑھ [2] ماثر الکرام ج اول ص ۲۱۳ [3] ایضاً۔

مگر انھوں نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کسی سے نہیں کیا، یہاں تک کہ غلام نقشبندؒ کو بھی اس کی خبر نہیں ہونے دی بلکہ ایک متعین دن سب لوگوں کو جمع کیا جن میں شہر کے مشائخ اور معززین بھی شامل تھے، اسی مجلس میں انھوں نے اکابر کی صف کے سامنے اپنے استاد کی مسند بچھائی، پھر شیخ غلام نقشبند کا ہاتھ پکڑ کر انہیں اس مسند پر بٹھا دیا اور خود ان کے سامنے مؤدب ہو کر بیٹھ گئے۔ یہ دیکھ کر سارے مریدین نے بھی ان کی پیروی کی[1]۔

ایک اشتباہ | صاحب نزہۃ الخواطر نے بھی شیخ غلام نقشبند کی سجادہ نشینی کا ذکر کیا ہے[2]، وہ لکھتے ہیں:-

اجلسه میر محمد شفیع المذکور علی سجادة شیخه فاستقل بها مدة حیاته[3]	میر محمد شفیع نے انہیں اپنے استاد کی مسند پر بٹھایا تھا، جس پر وہ تمام عمر متمکن رہے۔

مگر دوسری جگہ شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد انھوں نے ان کے ایک سن رسیدہ مرید اور عالم شیخ محمد آفاق بہاری لکھنوی (متوفی ۲۲ ربیع الثانی ۱۰۸۹ھ) کے مسند نشین ہونے کا ذکر کر کے[4] یہ صراحت کی ہے کہ ان کو اس مسند پر میر محمد شفیع نے بٹھایا تھا[5]۔

مولوی رحمٰن علی کے بیان کے مطابق شیخ پیر محمد کی رحلت کے بعد شیخ محمد آفاق بہاری مسند نشین بنائے گئے[6]، یہی بات درست معلوم ہوتی ہے، کیونکہ وہ شیخ پیر محمد کے تلامذہ میں سب سے زیادہ معمر تھے اور ان کو طویل صحبت بھی میسر

۱؎ ماثر الکرام ج ۱ ص ۲۱۴ اور سبحۃ المرجان ج ۱ ص ۲۰۲ ۲؎ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳ بحوالہ بحر ذخار۔
۳؎ ایضاً ج ۵ ص ۳۰۵، بحوالہ بحر ذخار ۴؎ ایضاً ج ۶ ص ۳۱۹ تذکرہ میر محمد شفیع ۵؎ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵

آئی تھی نیز شیخ پیر محمد کی وفات کے بعد وہ صرف چار سال ہی زندہ رہے اور ۱۰۸۹ھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ایسی صورت میں ماثر الکرام اور سبحۃ المرجان میں شیخ غلام نقشبند کی سجادہ نشینی کا جو تذکرہ ہے اس کی یہ توجیہ کی جا سکتی ہے کہ غالباً یہ شیخ محمد آفاق بہاری کے وصال کے بعد کا واقعہ ہوگا۔

درس و تدریس | شیخ غلام نقشبندؒ نے اپنی تمام عمر درس و تدریس میں گزاری اور وہ مختلف علوم و فنون کے جامع تھے، مگر تفسیر سے ان کو خاص شغف تھا، چنانچہ انکے شاگرد ان سے تفسیر بیضاوی پڑھا کرتے تھے[1]۔ اس عہد میں امیٹھی میں ملا جیون امیٹھوی (متوفی ۱۱۳۰ھ) کے درس کا اور لکھنؤ میں شیخ غلام نقشبندؒ کے درس و افادہ کا غلغلہ تھا، دور دور سے طلبہ ان دونوں بزرگوں کے حلقۂ درس میں شریک ہوتے تھے جن کے فیض سے وہ خود صاحبِ کمال بن کر نکلتے تھے۔

شیخ غلام نقشبندؒ کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے تلامذہ کے ساتھ بڑی شفقت و محبت سے پیش آتے تھے، جیسا کہ خود ان کے ساتھ ان کے استاد میر محمد شفیع کا بھی یہی مشفقانہ برتاؤ رہتا تھا، چنانچہ شیخ ذہین اور باصلاحیت طلبہ کی خوب حوصلہ افزائی کرتے اور تعلیم سے فراغت کے بعد بھی ان سے برابر ربط و تعلق رکھ کر ان کے حالات کی خبر رکھتے تھے اور ان کی کامیابی سے خوش ہوتے تھے[2]۔ ان کی اس بے پایاں شفقت و محبت اور تعلیم میں انہماک و یکسوئی کی وجہ سے اس دور کے اکثر ہندوستانی فضلا ان کے دامنِ فیض سے وابستہ ہو گئے تھے[3]، ان کے

۱؎ نزہۃ الخواطر.................. ج ۶ ص ۱۰۴ ۲؎ ماثر الکرام ج ۱ ص ۲۵۹ ۳؎ ایضاً ص ۲۱۴ و سبحۃ المرجان ج ۱ ص ۲۰۲۔

بعض ممتاز شاگردوں کے نام ملاحظہ ہوں، ملا نظام الدین سہالوی[1]، میر عبدالجلیل بلگرامی[2]، سید فرید الدین بلگرامی[3]، سید قادری بلگرامی[4]، شیخ محمد قاسم کاکوروی بجنوری[5]، شیخ نورالہدیٰ امیٹھوی[6] اور مفتی شرف الدین لکھنوی[7]

شعر و شاعری

شیخ غلام نقشبندؒ کی قدیم عربی شاعری سے واقفیت کا ذکر پہلے آچکا ہے، ان کو خود بھی شعر و شاعری کا اچھا ذوق تھا وہ فن عروض سے بھی اچھی طرح واقف تھے اور اس فن میں ایک تصنیف بھی یادگار چھوڑی ہے[8]، گو تذکرہ نگاروں نے ان کے کسی دیوان کا ذکر نہیں کیا ہے، تاہم وہ ایک کہنہ مشق شاعر تھے جن کا کلام قدیم شاعری کے محاسن کا جامع ہوتا تھا، انھوں نے اپنے استاد میر محمد شفیع کی شان میں ایک طویل قصیدہ کہا تھا جو تیس اشعار پر مشتمل ہے، یہ پورا قصیدہ مشہور جاہلی شاعر امراؤالقیس کے اس قصیدہ کے وزن و قافیہ اور اسی طرز و انداز پر کہا گیا ہے جو سبعہ معلقہ میں قفا نبک سے شروع ہوتا ہے، شیخ کے قصیدہ کا مطلع یہ ہے:

خلیلی هل دعاتان دارة جلجل ودارة سلمی فالقفاف فعقنقل[9]

دربار شاہی میں رسوخ اور قدر و منزلت

شیخ غلام نقشبندؒ ایک گوشہ نشین اور زاہد عالم تھے، ان کی دلچسپی صرف درس و افادہ تک محدود تھی، تاہم ان کے تلامذہ دور دور تک پھیلے ہوئے تھے اور بعض بادشاہوں کے مقرب اور اہم سرکاری عہدوں پر بھی فائز تھے[10]، اس لیے وہ دربار شاہی میں غیر متعارف نہ رہے ہوں گے، چنانچہ

[1] مآثر الکرام ج اول ص ۲۲۰ [2] ایضاً ص ۱۵۸ - ۱۵۹ [3] ایضاً ص ۱۴۳ [4] ایضاً ص ۱۴۴ [5] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۳۴۷ [6] ایضاً ص ۳۹۶ [7] ایضاً ص ۱۰۴ - ۱۰۵ [8] مآثر الکرام ج اول ص ۲۱۶ [9] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳-۲۱۴، نزہۃ الخواطر میں پورا قصیدہ درج ہے [10] ایضاً ص ۱۰۵

ان کا علمی شہرہ سن کر شاہ عالم بہادر شاہ اول فرزند اورنگ زیب عالمگیرؒ نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی، ملاقات ہونے پر بادشاہ نہایت عزت و تکریم کے ساتھ پیش آیا[1]

صاحب نزہۃ الخواطر نے سبحۃ المرجان کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بہادر شاہ نے ان سے لکھنؤ میں ملاقات کی تھی[2]، مگر سبحۃ المرجان میں یہ صراحت موجود نہیں ہے درحاصل یہ ملاقات دہلی ہی میں بہادر شاہ اول کی تخت نشینی (۱۱۱۸ھ) کے بعد اس وقت ہوئی جب شیخ غلام نقشبندؒ کی شہرت کے شباب کا زمانہ تھا، غالباً انکی فرط شہرت ہی کی بنا پر بادشاہ نے ان کو طلب بھی کیا ہوگا۔ مولوی رحمان علی لکھتے ہیں:

شاہ عالم ابن اورنگ زیب	شاہ عالم بن اورنگ زیب کو جب
بادشاہ شہرۂ کمالش اصغا	ان کے شہرۂ کمال کی اطلاع ہوئی
کردہ او را بحضور طلبید و با عزاز و	تو ان کو دربار میں طلب کیا اور بڑے
اکرام تمام پیش آمدہ[3]	اعزاز و اکرام کے ساتھ پیش آیا۔

اخلاق و عادات

شیخ غلام نقشبندؒ بڑے خلیق، متواضع اور خدا ترس بزرگ تھے، وہ شریعت کے آئین و اصول کی پابندی پر خاص زور دیتے تھے اور اس بارہ میں کسی قدر متشدد بھی تھے، میر غلام علی آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق "شیخ نقشبندؒ حدود شریعت کے محافظ اور ملت بیضاء کے نگراں تھے"[4] چنانچہ جب کسی شخص کو خلاف شرع کام کرتے دیکھتے تو بڑے کبیدہ خاطر ہوجاتے اور ترک تعلق بھی کر لیتے تھے،

[1] مآثر الکرام جلد اول ص ۲۱۴ [2] سبحۃ المرجان ج ا ص ۲۰۲ نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳ [3] تذکرہ علمائے ہند ص ۱۵۸ [4] سبحۃ المرجان ج اول ص ۲۰۲۔

لیکن اگر وہ شخص اپنی غلط روش سے باز آجاتا اور صدق دل سے توبہ کر لیتا تو اس کی جانب سے ان کا دل صاف ہو جاتا اور وہ اس پر پہلے سے زیادہ لطف و کرم فرمانے لگتے، مآثر الکرام میں ہے:

مزاج اقدس ہمہ مصروف حفظ شریعت بود و بر وفق الحب للہ والبغض للہ از کسے امر نا ملایم می سرزد غبار سخت بر دامن خاطر والا می نشست، واگر آں کس توفیق توبہ می یافت زیادہ تر از سابق مورد الطاف می گردید[1]	مزاج اقدس میں ہر وقت حفظ شریعت ہی کا خیال رہتا تھا الحب للہ والبغض للہ کے مصداق اگر کسی سے کوئی نامعقول حرکت سرزد ہو جاتی تو اس کی جانب سے ان کے دل میں گرد و غبار جم جاتا اور اگر اس شخص کو توبہ کی توفیق ہو جاتی تو پھر پہلے سے بھی زیادہ اس پر مہربان ہو جاتے۔

وفات لکھنؤ میں اخیر رجب ۱۱۲۶ھ میں وفات پائی[2]۔ ایک قول کے مطابق جمادی الاولیٰ کا مہینہ تھا اور لکھنؤ ہی میں دریائے گومتی کے کنارے ٹیلہ شیخ پیر محمد میں تدفین ہوئی[3]۔ اسی ٹیلہ پر ان کے استاد شیخ پیر محمد بھی مدفون ہیں۔ جس کے بعد سے یہ ٹیلہ انکی نسبت سے مشہور ہوا[4]۔

اولاد ان کے صرف ایک صاحبزادے شیخ احمد کا ذکر تذکرہ کی کتابوں میں ملتا ہے، جو اپنے والد کے بعد مدرسۂ شیخ پیر محمد کے مدرس مقرر ہوئے تھے[5]۔ بعد ازاں

[1] مآثر الکرام ج اول ص ۲۱۲ [2] ایضاً ص ۲۱۷ [3] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۴ [4] ایضاً جلد ۵ ص ۹۷ [5] نزہۃ الخواطر ج ۶ ص ۲۱۳۔

وہ منصب مشیخت پر بھی فائز ہوئے جس پر ان کے بعد ان کے فرزند قطب الہدیٰ فائز ہوئے[1]۔

تصنیفات شیخ غلام نقشبندؒ کا زیادہ وقت درس و تدریس میں بسر ہوا، ان کو تفسیر سے خاص مناسبت تھی اور عموماً کتب تفسیر ہی ان کے زیر درس ہوتی تھیں؛ انھوں نے جو کتابیں لکھی ہیں ان میں سے اکثر کا تعلق اسی فن سے ہے، لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے وہ دوسرے علوم میں بھی دستگاہ عالی رکھتے تھے، چنانچہ علم ہیئت؛ عروض اور تصوف میں بھی ان کی کتابیں یادگار ہیں لیکن ان کی اکثر تصنیفات ناپید ہیں، جن کتابوں کا سراغ ملتا ہے وہ یہ ہیں:۔

۱۔ تفسیر انوار الفرقان وازھار القرآن: یہ قرآن مجید کے ربع اول کی عربی زبان میں تفسیر ہے جس پر مصنف کے حواشی بھی ہیں، اس کے قلمی نسخے کتبخانہ ریاست رام پور[2] خدا بخش اورینٹل لائبریری پٹنہ[3] اور مکتبہ رحمانیہ مدراس میں موجود ہیں[4]، آگے اس کا مفصل تذکرہ کیا جائے گا۔ ۲۔ تفسیر سورۂ اعراف: یہ تفسیر بیضاوی کے دو قدیم حاشیوں پر تشریحی نوٹ ہیں، اس کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن میں موجود ہے[5]۔ ۳۔ مختلف سورتوں کی علحدہ علحدہ تفسیریں ۵۔ بعض مشکل آیات کی تفسیر ۶۔ فرقان الانوار ۷۔ اور لامعہ عرشیہ در مسئلہ

[1] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۲۴۴ [2] فہرست کتب عربیہ کتب خانہ ریاست رام پور مرتبہ مولوی محمد نبی صاحب جلد دوم ص ۵۶ [3] مفتاح الکنوز جلد سوم ص ۱۷ [4] ہندوستانی مفسرین اور انکی عربی تفسیریں از ڈاکٹر محمد سالم قدوائی ص ۱۲۱ [5] فہرست مخطوطات عربی انڈیا آفس از سی اے اسٹوری جلد دوم ص ۶۳-۶۴ نمبر ۱۱۵۹

وحدت الوجود ۸۔ شرح قصیدہ خزرجیہ در علم عروض[۱] ۹۔ شرح قصیدہ مطالع الدقائق در علم ہیئت[۲]

تفسیر انوار الفرقان و ازہار القرآن اس تفسیر کے تین قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں ملتے ہیں، مدراس کے مکتبہ رحمانیہ کے نسخہ کو مصنف کے قلم کا بتایا جاتا ہے، اس پر ان کی مہر بھی ہے جو ۱۱۲۱ھ کی ہے۔ خدابخش لائبریری کا نسخہ بڑی تقطیع میں ۱۳۷۵ اوراق پر مشتمل ہے، اس کے ہر صفحہ میں ۲۹ سطریں ہیں اور کتابت ۱۱۱۵ھ کی ہے[۳] اس نسخہ میں قرآن کریم کی آیتیں سرخ روشنائی سے لکھی ہیں، کتابت صاف ہے، حاشیہ پر کہیں کہیں نوٹ درج ہیں، شروع کے چند صفحات بوسیدہ ہیں، تاہم نسخہ مکمل ہے۔

تیسرا نسخہ کتب خانہ ریاست رام پور میں ہے جو زیادہ واضح اور مفصل ہے[۴]

[۱] آثار الکرام جلد اول ص ۲۱۶ [۲] فہرست کتب عربیہ جلد دوم ص ۷، ۵ [۳] مفتاح الکنوز جلد سوم ص ۱۷ [۴] ڈاکٹر محمد سالم قدوائی نے رام پور میں اس تفسیر کے دو قلمی نسخے بتائے ہیں، ان کے بیان کے مطابق دوسرا نسخہ نامکمل ہے جو ۴۱۲ صفحات پر مشتمل ہے اور یہ سورۂ بقرہ ہی تک ہے اور اس کا کچھ ابتدائی حصہ غائب بھی ہے (ہندوستانی مفسرین ص ۱۲) مگر کتب خانہ ریاست رامپور کی فہرست میں اس تفسیر کے صرف ایک ہی نسخہ کا ذکر ملتا ہے، غالباً یہ دوسرا نسخہ جس کو ڈاکٹر محمد سالم صاحب نے شیخ غلام نقشبند کی تفسیر انوار القرآن سمجھ لیا ہے اس لائبریری میں محفوظ ایک دوسری تفسیر انوار القرآن ہے، جسکے مصنف امام محمد بن حسن المعروف بابن مقسم النحوی المتوفی ۳۳۱ھ ہیں اس تفسیر کے تعارف میں مرتب فہرست نے لکھا ہے کہ یہ چار سو چار صفحات پر مشتمل ابتداء قرآن سے سورۂ بقرہ کے آخر تک کی تفسیر ہے اور اسکے ابتدائی چار صفحات غائب ہیں، (ملاحظہ ہو فہرست عربیہ جلد اول ص ۲۰)

یہ نسخہ ۸۶۳ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے تعارف میں مرتب فہرست مخطوطات نے حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:

"تقطیع کتابت طولاً مختلف، کہیں ۱۰ انچ، کہیں اس سے کم و بیش، عرضاً تقریباً ۴ انچ، سطور ۱۲ سے ۲۳ تک، صفحہ ۶۶۹ تک خط نسخ عمدہ ایک قلم سے لکھا ہوا ہے، اس کے بعد آخر کتاب تک خط نسخ مختلف ہے، اکثر اوراق کتاب پر حواشی بھی نستعلیق پختہ خط میں تحریر ہیں، جن کا کاتب دوسرا شخص معلوم ہوتا ہے، تمام اوراق پر دیمک کا زیادہ اثر پایا جاتا ہے، ۱۹۱۴ء میں کتاب بحالت کذائی خرید ہوئی، آیات قرآنیہ شنجرف سے معرب، تفسیر سیاہی سے غیر معرب لکھی ہے، کاتب نے اپنا نام آخر کتاب پر اس عنوان سے تحریر کیا ہے،" کتبہ محمد التفات مبارز خانی تحریر فی التاریخ پانزدہم شہر ربیع الثانی روز یکشنبہ، یک نیم پہر روز بر آمدہ قصبہ لاہرپور در حویلی متبرکہ مولوی صاحب قبلہ علی عظیم الدین خاں باتمام رسید" سال کتابت نہیں لکھا ہے، اسی آخری صفحہ پر ایک عربی قطعہ نستعلیق خط میں تحریر ہے، جس سے ۱۱۱۰ھ نکلتے ہیں، یہ امر منقح نہیں ہوتا کہ ۱۱۱۰ھ تالیف کے سنہ ہیں یا کتابت کے، قطعہ یہ ہے:

سیختم بشری ان ہذا لعامہ ینادی علی توتلی وذلک یختم
نعلیک شیخ القوم للہ ختمہ وللہ ختمہ فیہ سر معظم
۱۱۱۰ھ

یہ تفسیر با حواشی ربع اول قرآن شریف کی ہے، حضرت مصنف نے پورے قرآن کی بالاستیعاب تفسیر نہیں لکھی ہے ..... تفسیر ربع قرآن میں زیادہ بسط نہیں کیا گیا ہے، ضروری قدر پر اکتفا ہے۔ عبارت آغاز صفحہ اول "الحمد للہ الذی جعل القرآن نوراً للہدی" خاتمہ صفحہ ۸۶۳ "صار فی الدنیا خلیفہ وعند اللہ

ملکا[1]

شیخ غلام نقشبندؒ کی یہ تفسیر ابتدائے قرآن سے سورۂ انعام کے اختتام تک ہے، اس کے آغاز میں مصنف کے قلم سے ایک مقدمہ بھی ہے جس میں فن تفسیر کی اہمیت اور ضرورت بتائی گئی ہے، مقدمہ ہی سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ یہ تفسیر سنہ ۱۱۱۱ھ میں مکمل ہوئی[2] تفسیر کے اخیر میں جو عربی قطعہ دیا گیا ہے اس کا تعلق تاریخ کتابت کے بجائے تکمیل تصنیف سے ہے،

شیخ غلام نقشبندؒ کی تفسیری خصوصیات

شیخ غلام نقشبندؒ کی تفسیر انوار القرآن اور ان کے دوسرے تفسیری اجزا اور رسائل کے مخاطب دراصل طلبہ ہیں اور یہ بالعموم تفسیر بیضاوی کی شرح اور حواشی پر مشتمل ہیں، ان کے بارے میں جو معلومات دستیاب ہوتی ہیں ان سے ان کی مندرجۂ ذیل خصوصیات کا علم ہوتا ہے۔

۱۔ ربط سور کا اہتمام :۔ شیخ غلام نقشبندؒ قرآن مجید کی سورتوں میں ربط و مناسبت کے قائل تھے، چنانچہ سورۂ اعراف کی تفسیر کی ابتدا میں وہ لکھتے ہیں:

وجہ المناسبۃ بین السورتین	دونوں سورتوں (انعام اور اعراف)
ان خاتمۃ الاولی وعد و	کے درمیان وجہ مناسبت یہ ہے کہ
وعید وفاتحۃ الثانیۃ	پہلی (انعام) کا اختتام وعدہ وعید پر
انذار وتذکیر وبیان	ہوا ہے اور دوسری (اعراف) کا آغاز
اھلاک القرون الخالیۃ	انذار و تذکیر اور گذشتہ قوموں اور
والقری الماضیۃ[3]	آبادیوں کی ہلاکت و بربادی کے ذکر

[1] فہرست کتب عربیہ جلد دوم ص ۵۶ - ۵۷ [2] ہندوستانی مفسرین ص ۱۲۱-۱۲۲ [3] فہرست مخطوطات عربی انڈیا آفس جلد دوم ص ۴۶-

سے ہوا ہے۔

۲۔ تفسیر بیضاوی کی تشریح و توضیح :۔ شیخ غلام نقشبندؒ تفسیر بیضاوی کے بڑے شیدائی تھے، وہ اسی تفسیر کو پڑھاتے تھے اور عموماً ان کی تمام تحریریں اسی کی تشریح و توضیح پر مشتمل ہوتی تھیں، انھوں نے اپنے ایک شاگرد سے اس تفسیر پر کیے گئے بعض اعتراضات کے جوابات بھی لکھوائے تھے، جس کا ایک قلمی نسخہ "تسعہ کلمات تتعلق بتفسیر القاضی البیضاوی" کے نام سے نہایت بوسیدہ حالت میں انڈیا آفس میں موجود ہے[1]،

۳۔ جدت و ابتکار :۔ شیخ غلام نقشبندؒ کا تمام تفسیری سرمایہ محض تشریح و حاشیہ آرائی ہی نہیں ہے بلکہ انھوں نے بعض آیتوں کی تفسیر و تاویل میں جدت و ابتکار سے بھی کام لیا ہے، چنانچہ وہ سورہ آل عمران کی آیت وما کان لنبی ان یغل[2] کی تفسیر میں عام مفسرین کے برخلاف یہ لکھتے ہیں:

" یہ احکام جہاد میں سے ایک حکم ہے غلالہ ایک قسم کا لباس ہے جو زرہ کے نیچے پہنا جاتا ہے، درخت کی جڑ میں جو پانی دیا جاتا ہے اسے بھی غلالہ کہتے ہیں[3]۔

یہ تفسیر ہماری نظر سے نہیں گزری ہے اس لیے اس کی خصوصیات کے بارے میں مزید تفصیل نہیں کی جا سکی، اس کے متعلق مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تفسیر قدماء کے شرح و حواشی پر مشتمل ایک آسان تفسیر ہے، اور چونکہ طلبہ کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہے اس لیے اس میں فنی نکات اور لغت کے مسائل سے زیادہ بحث نہیں کی گئی ہے، طلبہ کے مذاق کی رعایت کر کے زیادہ تر نماز، روزہ اور وضو وغیرہ کے مسائل پر

[1] فہرست مخطوطات عربی انڈیا آفس جلد دوم ص ۳۴۴ نمبر ۱۱۲۷ [2] سورۂ آل عمران آیت ۱۶۱ [3] بحوالہ ہندوستانی مفسرین ص ۱۲۲-۱۲۳۔

تفصیل سے بحث کی گئی ہے جس کی تائید میں احادیث نبوی اور ائمۂ فقہ کے اقوال بھی پیش کیے گئے ہیں یہ گویا شیخ غلام نقشبند کی تفسیر کو تعلیمات قرآنی کا مجموعہ کہا جا سکتا ہے۔

شیخ علی اصغر قنوجی

نام ونسب اور خاندانی حالات علی اصغر نام اور والد کا نام عبد الصمد تھا، ان کا تعلق شیخ عماد الدین کرمانی مولف "فصول عمادیہ" کے خاندان سے ہے اور سلسلۂ نسب امیر المومنین حضرت ابوبکر صدیقؓ سے ملتا ہے۔[۱]

ان کے آباو اجداد تلاش روزگار میں مدینہ طیبہ سے نقل مکانی کرکے کرمان میں جا بسے تھے، پھر وہاں سے شیخ عماد الدین کرمانی کے ایک فرزند شیخ مبارک ہندوستان آئے اور قنوج میں اقامت گزیں ہوئے اسی وقت سے اس خاندان کے لوگ قنوج میں آباد ہیں۔[۲]

ولادت شیخ علی اصغر ۱۰۵۱ھ میں قنوج میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی۔[۳]

تعلیم ابتدائی تعلیم قنوج ہی کے ایک عالم سید محمد حسینؒ سے حاصل کی، پھر مزید تعلیم مولانا عصمت اللہ سہارنپوری، مولانا محمد زماں کاکوروی اور نواب دیانت خاں سے پائی۔[۴] اور آخیر میں علامہ لطف اللہ کوڑوی سے آخری درجہ کی کتابیں پڑھ کر سند فضیلت حاصل کی یہیں کے درس میں انکے ہم سبق مشہور عالم ملا جیون امیٹھوی تھے۔[۵]

---

۱ بحوالہ ہندوستانی مفسرین ص ۱۲۲-۱۲۳ ۲ مآثر الکرام جلد اول ص ۲۵ ۳ ایضاً ۴ نزہۃ الخواطر جلد ۵ ص ۱۷۸
۵ مآثر الکرام جلد اول ص ۲۵۔ نواب صدیق حسن خاں قنوجی نے شیخ علی اصغر کے اساتذہ کی فہرست میں علامہ لطف اللہ کوڑوی کا نام نہیں ذکر کیا ہے، ملاحظہ ہو۔ ابجد العلوم ص ۹۳۰۔

راہ سلوک شیخ علی اصغر کو تصوف و سلوک سے فطرتاً مناسبت تھی، اس لیے وہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد براہ راست لکھنؤ کے لیے عازم سفر ہوئے اور وہاں انھوں نے شیخ پیر محمد لکھنوی سے بیعت کی اور ان کی خدمت میں رہ کر تصوف کے اور اد و اشغال سیکھے، پھر ان سے خلافت حاصل کرکے قنوج لوٹے اور وہیں اپنی پوری عمر نہایت خاموشی اور یکسوئی سے گزاری۔[۱]

درس و افادہ شیخ علی اصغر نے قنوج میں تمام عمر درس و افادہ کا بازار گرم رکھا اور بے شمار لوگوں نے ان سے استفادہ کیا، میر غلام علی آزاد بلگرامی کا بیان ہے:

مدت شصت سال درس	مسلسل ساٹھ سال تک درس دیتے
گفت خلقے کثیر در حوزۂ درس	رہے اور بہت سے لوگ ان کے
او منتہائے فضیلت حاصل کردند[۲]	درس سے فاضل و کامل ہو کے نکلے،

شیخ علی اصغر کے دائرۂ تلمذ میں خود ان کے فرزند ارجمند شیخ رستم علی قنوجی شامل ہیں جو صاحب تصنیف مفسر گزرے ہیں، ان کے علاوہ مولوی محمد امجد قنوجی محشی صدرا اور مولوی فتح علی قنوجی قاضی قنوج بھی انکے ممتاز تلامذہ میں ہیں۔[۳]

اخلاق و عادات شیخ علی اصغر بڑے برگزیدہ اور مقدس بزرگ تھے، میر غلام علی آزاد کو ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

فقیر دو سہ صحبت مولوی را	فقیر کو دو تین مرتبہ ملاقات کا شرف
دریافت ذات قدس معلی بود[۴]	حاصل ہو چکا ہے، بڑی ہی برگزیدہ

---

۱ مآثر الکرام جلد اول ص ۲۵۱ ۲ ایضاً ۳ ابجد العلوم ص ۹۳۲-۳۳-۳۴ ۴ مآثر الکرام جلد اول ص ۲۵۱۔

اور مقدس شخصیت تھی،

ان کے ہم وطن نواب صدیق حسن خاں قنوجی بھی ان کی عظمت و بزرگی کے معترف ہیں، لکھتے ہیں :

جامع بود میان علم شریعت — وہ شریعت اور طریقت کے جامع
وطریقت [1] — بزرگ تھے،

وفات | ۱۵ شعبان ۱۱۴۰ھ میں وفات پائی اور اپنی مسجد کے سامنے ہی ایک چبوترہ پر دفن کیے گئے۔[2] میر غلام علی آزاد نے تاریخ وفات کہی ہے :- شد نہاں آفتاب صبح علوم ۱۱۴۰ھ

اولاد | شیخ علی اصغر کے صرف دو صاحبزادوں کا ذکر تذکرہ کی کتابوں میں ملتا ہے، انکے علاوہ ان کی ازواج و اولاد کا کچھ حال معلوم نہیں ہو سکا۔

۱۔ مولانا محمد کامل (المتوفی ۱۱۴۶ھ) یہ غالباً بڑے صاحبزادے تھے، سلسلۂ نقشبندیہ کے مشائخ میں ان کا شمار ہوتا تھا اور ان سے خود ان کے برادر خرد شیخ رستم علی قنوجی نے اس سلسلہ کی اجازت حاصل کی تھی[3]

۲۔ شیخ رستم علی (المتوفی ۱۱۷۸ھ) یہ درس و تدریس اور تصنیف و تالیف میں اپنے والد کے جانشین ہوئے[4]

تصنیفات | شیخ علی اصغر نے کئی کتابیں لکھیں اور یہ سب علم تصوف سے متعلق ہیں[5] ان کے علاوہ انھوں نے ایک تفسیر ثواقب التنزیل لکھی جو ان کی سب سے آخری تصنیف ہے[6]، نواب صدیق حسن خاں کے بیان کے مطابق انھوں نے منظوم کتابیں بھی لکھیں،[7] جو

[1] تقصار جیود الاحرار من تذکار جنود الابرار ص ۹۰ [2] مآثر الکرام جلد اول ص ۲۵۱ و نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۱۸۶
[3] مآثر الکرام جلد اول ص ۲۵۱ [4] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۸۰ [5] ابجد العلوم ص ۹۳۳ [6] ایضاً [7]
مآثر الکرام جلد اول ص ۲۵۱ [8] تقصار جیود الاحرار ص ۱۸۹۔

ن شعر و شاعری سے ان کی واقفیت کی دلیل ہے، تاہم ان کا کوئی شعری مجموعہ دستیاب نہیں ہے، ان کی تصنیفات حسب ذیل ہیں :

۱۔ اللطائف العلیہ فی المعارف الالٰہیۃ :- یہ کتاب فن تصوف میں شیخ ابن عربی کی فصوص الحکم کے طرز پر لکھی گئی تھی۔

۲۔ تبصرۃ المدارج :- اس میں شیخ پیر محمد کے افادات جمع کیے گئے تھے[1]

۳۔ القصیدۃ المھیمنۃ فی النفحۃ المحمدیۃ :- یہ غالباً ان کا کوئی متصوفانہ منظوم رسالہ تھا۔

۴۔ النفائس العلیہ فی کشف اسرار المھیمنہ :- یہ قصیدہ مہیمنہ کی شرح ہے جو خود انھوں نے لکھی تھی۔

۵۔ شرح فصوص الحکم :- نواب صدیق حسن خاں کے بیان کے مطابق انھوں نے فصوص کی تلخیص بھی کی تھی[2]

۶۔ ریاض المعارف :- حقائق و معارف پر مشتمل ایک صوفیانہ کتاب یا رسالہ تھا۔[3]

۷۔ ثواقب التنزیل فی اشارۃ التاویل :- یہ تفسیر جلالین کے انداز کی ایک مختصر اور جامع تفسیر تھی، جس کے بارہ میں نواب صدیق حسن خاں کا بیان ہے کہ یہ جلالین سے زیادہ بلیغ اور متین ہے[4] اس تفسیر کا ایک ناقص قلمی نسخہ کتب خانہ ریاست رامپور میں محفوظ ہے[5] اس کے علاوہ اس کے کسی اور نسخہ کا علم نہیں، ان کی دوسری کتابوں کا بھی کہیں سراغ نہیں لگتا۔

[1] ابجد العلوم ص ۹۳۰ [2] ایضاً [3] نزہۃ الخواطر جلد ۶ ص ۱۸۰ [4] ابجد العلوم ص ۹۳۰ [5] فہرست کتب عربی کتبخانہ ریاست رامپور جلد اول ص ۲۶

تفسیر ثواقب التنزیل فی اشارۃ التاویل کی چند خصوصیات

یہ عربی زبان میں ایک مختصر اور عمدہ تفسیر ہے اور اس کا جو نسخہ رامپور میں دستیاب ہے اس میں صرف نوّے صفحات ہیں جو سورۂ فاتحہ کے آغاز سے سورۂ بقرہ کی ابتدا تک خط نستعلیق میں لکھے ہوئے ہیں[۱]۔ اسکی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے :

"الحمد للہ العلیم الحکیم الذی انزل علیٰ عبدہ کتابا فاتحتہ السبع المثانی والقرآن العظیم"

اور اختتام اس نامکمل عبارت پر ہوا ہے :۔

" ذلک اشارۃ الی الم المذکور قبلہ ..... بالمولف من ھذہ الحروف"

شیخ علی اصغر کی یہ تفسیر گو نامکمل ہے، تاہم اس سے بھی اسکی بعض نمایاں خصوصیات کا پتہ چلتا ہے جن کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ مکمل قرآن مجید کی سات ثواقب میں تقسیم :۔ شیخ علی اصغر نے اس تفسیر میں پورے قرآن مجید کو سات ثواقب میں تقسیم کیا ہے، پہلے ثاقب میں تنہا سورۂ فاتحہ ہے اسکے بعد سورۂ بقرہ اور آل عمران کو دوسرے ثاقب میں رکھا گیا ہے۔ چونکہ تفسیر ناقص ہے اس لیے مزید ثواقب کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کہاں سے کہاں تک ہیں، یہ تصور انھوں نے سورۂ فاتحہ کی سات آیات، سبع طوال اور حوامیم کی تعداد سے اخذ کیا ہے، جس سے انکی ذہانت اور قرآن مجید سے دلچسپی اور شیفتگی کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔

۲۔ عدد سات کا خاص اہتمام :۔ سات کا عدد چونکہ انکے نزدیک قرآن مجید کی اندرونی شہادتوں کی بنیاد پر اہم اور بابرکت ہے اسلیے انھوں نے مسائل کی تشریح اور بحث وتحقیق میں بھی اس کو ملحوظ رکھا ہے، چنانچہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر کے بعد انھوں نے اعجاز القرآن پر

[۱] فہرست کتب عربی کتبخانہ ریاست رامپور جلد اول ص ۲۶ ۔

بحث کی ہے اور اس میں بھی سات مسائل بیان کیے ہیں، پہلا مسئلہ نزول قرآن کا ہے، دوسرا یہ کہ حضرت جبرئیل کتنی مقدار میں قرآن لاتے تھے، تیسرا یہ کہ نزول وحی کے وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کیا کیفیت ہوتی تھی، چوتھے مسئلہ میں دکھایا ہے کہ کون سی آیات مکی ہیں اور کون سی مدنی، پانچواں مسئلہ یہ ہے کہ نزول قرآن کی ترتیب کیا تھی، چھٹا جمع اور ترتیب قرآن سے متعلق ہے اور ساتواں مسئلہ ان سات حروف کی تحقیق کے بارے میں ہے جن کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد گرامی "نزل القرآن علی سبعۃ احرف" پر ہے۔

۳۔ سلاست بیان :۔ شیخ علی اصغر کو عربی زبان پر بہت عبور اور قدرت حاصل تھی، جس کا اندازہ انکے طرز تحریر سے ہوتا ہے، حروف مقطعات پر بحث کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

ولیعلم ان المقطعات فی	جاننا چاہیئے کہ سورتوں کے آغاز میں
اوائل السور من المتشابہات	حروف مقطعات متشابہات کی قبیل
لا یعلم تاویلہ الا اللہ کما	سے ہیں جنکا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے،
قیل ان لکل کتاب سر وسر	جیسا کہ مقولہ ہے ہر کتاب کا ایک راز
القرآن فواتح السور[۱]	ہوتا ہے اور قرآن کا راز سورتوں کے
	ابتدائی حصے ہیں۔

۴۔ روایات اور اقوال ائمہ سے استدلال :۔ اس تفسیر کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں دلائل کے طور پر روایتوں اور ائمہ کے اقوال کو بھی ذکر کیا گیا ہے، پھر ان میں محاکمہ کر کے کسی ایک کو ترجیح دی گئی ہے۔

۵۔ کتب لغت ونحو سے مراجعت :۔ اسی کیساتھ الفاظ کی لغوی تحقیق میں اہم کتب لغت و نحو سے بھی مدد لی گئی ہے، چنانچہ اس تفسیر میں زجاج، سیبویہ، صاحب صحاح اور تاج العروس کے حوالے بکثرت ملتے ہیں۔

مذکورہ بالا خصوصیات کی روشنی میں بجا طور پر کہا جا سکتا ہے کہ شیخ علی اصغر کی یہ تفسیر اپنی متانت اور فنی نکات کے اعتبار سے ایک اہم تفسیر ہے، مگر افسوس کہ اس کا کوئی مکمل نسخہ کہیں دستیاب نہیں ہے۔

"فتح نامۂ محمود شاہی پر ایک تحقیقی نظر"

میں مشمولہ ابیات کے استقام کا جائزہ

از

ڈاکٹر عبد الرب عرفان

ماہنامہ معارف (بابت ماہ جولائی ۱۹۹۱ء) میں ڈاکٹر نور السعید اختر (استاد زبان و ادبیات فارسی، مہاراشٹر کالج بمبی) کا مضمون "فتح نامۂ محمود شاہی پر ایک تحقیقی نظر" نظر سے گزرا[1]۔ موصوف نے اس میں عیانی کی مثنوی کا جائزہ تاریخی واقعات کی روشنی میں لیتے ہوئے ایک سو بتیس[۱۳۲] ابیات نقل کی ہیں۔ علاوہ بریں عیانی کی کلیات سے بھی بارہ[۱۲] شعر مضمون میں شامل ہیں لیکن ان اشعار و ابیات کی ایک معتد بہ تعداد گوناگوں استقام سے مملو ہے، جس کے لیے شاعر ذمہ دار نہیں۔ ان میں سے بیشتر ابیات و اشعار میں نقل و کتابت کے دوران تحریف و تصرف سے مسخ ہونے کا غالب گمان ہے، چند ابیات کی صورت ڈاکٹر صاحب نے مسخ فرمائی ہے۔ ثبوت آگے آئے گا۔

ڈاکٹر صاحب کی نقل کردہ ابیات کا جائزہ لینے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ "طبع موزوں" کے مالک ہیں اور نہ فن شعر گوئی اور اس سے قریبی تعلق رکھنے

---

[1] یہ مضمون بہت پہلے آیا تھا مگر جگہ نہ نکلنے کی وجہ سے اشاعت میں تاخیر ہوگئی۔ (معارف)

والے فنون کا علم رکھتے ہیں۔ سب سے زیادہ حیرت تو اس بات پر ہے کہ انھوں نے متعدد درست اور واضح ابیات کی غلط قرأت کر کے ان کی روشنی میں تاریخی واقعات بھی بیان کر دیے ہیں اور انہیں واقعات کے استناد کی غرض سے نقل بھی کیا ہے۔ مضمون نگار سے ابیات و اشعار نقل کرنے میں جو غلطیاں سرزد ہوئی ہیں ان کی نوعیتیں درج ذیل ہیں:

(۱) تحریف شدہ اشعار جنھیں درست سمجھ کر حرف بحرف نقل کر لیا گیا۔

(۲) درست اشعار جن کے مفہوم تک مضمون نگار کے ذہن کی رسائی نہیں ہو سکی۔ اسی کے اعتراف کی علامت کے بطور ان کے آخر میں (کذا) ثبت کر دیا گیا ہے۔

(۳) درست اشعار جن میں کسی لفظ کی غلط قرأت سے مفہوم متاثر اور "مدعا عنقا" ہو گیا ہے۔

(۴) وہ اشعار جو کسی لفظ یا الفاظ کے اضافے سے اپنا وزن کھو بیٹھے ہیں۔

(۵) وہ اشعار جو کسی لفظ یا الفاظ کے حذف ہو جانے سے ناموزوں ہو گئے ہیں۔

ذیل میں مذکورہ بالا نوعیتوں کے تمام اشعار و ابیات کا ایک سرسری جائزہ پیش خدمت ہے۔ جن اشعار پر تبصرہ کیا گیا ہے وہ اصل مضمون سے بجنسہ نقل کیے گئے ہیں۔ ان میں اگر املا کی عدم یکسانیت ہو تو اس کی ذمہ داری راقم حروف پر نہیں، مضمون نگار پر عائد ہوتی ہے۔

(۱) قصیدہ و غزل و قطعہ و رباعی و فرد ز مثنوی و ز ترجیع بند آنچہ دارد نام (ص ۳۲ / س ۱)

شعر کی بحر مجتث مثمن مخبون محذوف / مقصور (مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلن / فعلان) میں ہے۔ یہ فارسی اور اردو کی مقبول ترین بحروں میں سے ایک ہے۔ مضمون نگار اس

بحر کے آہنگ سے آشنا ہوتے تو وہ ترجیع کے بعد "بند" کا اضافہ کرکے مصرع دوم کے وزن اور آہنگ کو غارت نہ کر دیتے ۔ غیر ضروری لفظ "بند" کو حذف کرنے کے بعد مصرعے کی تقطیع ملاحظہ فرمائیں :

مفاعلن فعلاتن مفاعلن فعلان

ز مثنوی ئی زترجی عِ آپ دا دو نام

(۳) ز بحر شعر بمدح سحاب است شما من فقیر، توانگر بگوہر آمدہ ام (کذا) (ص ۳۲، س ۵)

شعر کے آخر میں (کذا) لکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مقالہ نگار کے نزدیک وہ اپنی موجودہ صورت میں درست نہیں ۔ راقم عرض کرتا ہے کہ صرف ایک غلط حرف کو درست حرف سے تبدیل کر دیا جائے یعنی مصرع اول میں "است" کے الف کو "دال" سے بدل کر اسے "دست" بنا دیا جائے تو شعر پوری طرح واضح ہو جاتا ہے ۔ پہلے مصرعے کی درست قرأت یہ ہے : ز بحر شعر بمدح سحاب دست شما

(۳) عیانی گرچہ بے نانم نہ آنم کہ بر در ہا برائے تکیہ کردم (ص ۳۲، س ۹)

مقالہ نگار غالباً اس شعر کو درست مانتے ہیں کیونکہ اس کے آخر میں (کذا) یا سوالیہ نشان (؟) ثبت نہیں ہے ۔ لیکن دوسرے مصرعے کا ٹکڑا ــ برائے تکیہ کردم ــ سقیم اور اس کے مفہوم کو مجروح کر رہا ہے ۔ اس مصرعے کی صحیح قرأت یہ ہے :

کہ بر در ہا برای تکہ کردم

"بے نانم" کو "بی نانم" اور "برائے" کو "برای" (بدونِ ہمزۂ اضافت) لکھنا چاہیے ۔

(۴) عیانی نظم رنگین تو یکسر سرہ نقدیست کان از کانِ جانست (کذا) (ص ۳۲، س ۸)

(کذا) لکھ کر مقالہ نگار نے شعر میں کسی ایسے سہو کی موجودگی کی جانب اشارہ کیا ہے

جس کے باعث وہ شعر کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے ۔ قیاس ہے کہ مصرع ثانی میں پہلا کان (جو کہ + آن کا مخفف ہے) تفہیم کی راہ میں حائل ہوا ہے ۔ مگر شعر اپنی موجودہ صورت میں قطعی درست اور تحریف کے شائبے سے بھی پاک ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ "اے عیانی! تیری رنگین نظم (مراد اشعار) بالکل کھری پونجی ہے کیونکہ وہ جان کی کان (معدن) سے برآمد ہوئی ہے ۔

(۵) قطب زمانہ شاہ محب اللہ آنکہ او از جودت حساب گدا بادشاہ کند (ص ۳۲، س ۱۸)

دوسرے مصرعے میں لفظ "جودت" محل نظر ہے ۔ یہ نیکی، خوبی اور بھلائی کے معنوں میں آتا ہے جبکہ شعر کا مزاج اس کی جگہ سخاوت کا مفہوم دینے والے کسی ایسے لفظ کا متقاضی ہے جو سہ حرفی ہو اور جس کے دونوں موخر حروف ساکن ہوں تاکہ ایک حرف اور ایک طویل اضافت کی جگہ پہ لفظ "بی" کی گنجایش نکل آئے ۔ ایسا لفظ "جود" ہے جو جودت میں موجود ہے ۔ اب حرف "ت" کو "ب" سے بدل کر اس میں لگی ہوئی طویل اضافت کو "ی" کی صورت میں منتقل کر دیجیے تو "بی" بن جائے گا جو حساب کے ساتھ مل کر "بی حساب" ہو جائے گا ۔ اس کے بعد مصرعے میں "بادشاہ" جو غالباً قافیہ ہے تصحیح طلب رہ جاتا ہے ۔ گمان غالب ہے کہ اصل قافیہ "بادشا" (بدون ہائے ہوز) ہوگا جس کے دیگر قوافی خدا، ادا، رہا کی قسم کے الف پہ ختم ہونے والے الفاظ ہوں گے ۔ پہلے مصرعے میں محب اللہ کے جزو آخر کو ہمزہ اور الف مکسورہ کے بغیر (اللہ) لکھا جانا چاہیے ورنہ مصرعے کے وزن میں خلل واقع ہوگا ۔ شعر کی درست صورت بطور ذیل ہے :

قطب زمانہ شاہ محب اللہ آنکہ او از جودِ بی حساب گدا بادشا کند

یعنی زمانے کے قطب شاہ محب اللہ وہ ہستی ہیں جو اپنی بے حساب سخاوت سے فقیر کو بادشاہ بنا دیتے ہیں۔

شعر کے آخر میں مضمون نگار نے (کذا) یا سوالیہ نشان (؟) ثبت نہیں کیا ہے۔ گویا وہ اپنی نقل کردہ قرأت کو درست تسلیم کرتے ہیں۔

(۶) قطب زمانہ شاہ محب اللہ آنکہ ہست　　شاہ فلک سریر ملک لشکر و سپاہ (کذا) (ص ۳۳ / س ۱)

شعر کے آخر میں (کذا) کی موجودگی پتا دیتی ہے کہ مضمون نگار دوسرے مصرعے کا مفہوم سمجھنے سے قاصر رہے ہیں۔ دراصل اس میں دو ترکیبیں — "فلک سریر" (جس کا تخت آسمان ہو) اور — "ملک لشکر و سپاہ" (جس کا لشکر اور جس کی فوج فرشتوں کی جماعت ہو) — لفظ "شاہ" کے مضاف الیہ کے بطور آئی ہیں۔ منقولہ بالا شعر اپنی موجودہ صورت میں درست اور واضح ہے۔ اگر "محب اللہ" کے موخر جزو کو تشدید اور الف مکسورہ کے بغیر لکھا جاتا تو پہلے مصرعے سے وزن کا نقص بھی رفع ہو جاتا۔

(۷) حبیب الدین محب اللہ باشد　　ہمیشہ تا جہان را شاہ باشد (کذا) (ص ۳۴ / س ۳)

شعر کے آخر میں (کذا) کا ثبت کیا جانا بتا رہا ہے کہ مقالہ نگار اس کو سمجھنے سے قاصر رہے ہیں، حالانکہ اس میں کوئی پیچیدگی نہیں ہے۔ یہ ایک صاف اور سادہ سی دعائیہ بیت ترجیع ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک دنیا کو شاہ کی حاجت رہے اس وقت تک حبیب الدین محب اللہ سلامت رہیں۔

(۸) محمد علیہ الصلوٰۃ السلام　　کہ ایزد بہ او داد دوحی کلام (کذا) (ص ۳۶ / س ۶)

صلوٰۃ کو سین سے لکھا گیا ہے[۱]۔ (کذا) کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ شعر کی

[۱] یہ معارف کے کاتب کی غلطی ہے۔ دوسرے مصرعہ میں مقالہ نگار نے "دہی د کلام" لکھا تھا کاتب نے اسے "دحی کلام" کر دیا (معارف)

درست قرأت تک مضمون نگار کے ذہن کی رسائی نہیں ہو سکی۔ اگر وہ چاہتے تو ادنیٰ تامل "دہی" کو "وحی" بنا لیتے۔ شعر درست اور مفہوم واضح ہو جاتا: "کہ ایزد بہ او داد وحی کلام"

(۹) شہنشاہ جم جاہ محمود شاہ　　شبہ انجن چرخ انجم سپاہ (ص ۳۶ / س ۹)

شعر کے آخر میں (کذا) یا کسی اور علامت کی عدم موجودگی اس امر کا اظہار ہے کہ مقالہ نگار کی نظر میں شعر درست اور بامعنی ہے لیکن راقم حروف کو اسے درست تسلیم کرنے میں تامل ہے۔

مصرع ثانی کے ابتدائی تین الفاظ ناستوار کاتبوں کے تصرف سے یکسر مسخ ہو گئے ہیں تاہم بعض رہنما الفاظ کے محفوظ رہ جانے سے قیاسی تصحیح کی گنجائش ہے اور متن منشائے مصنف کے مطابق نہ سہی، اس کے قریب تر ضرور پہنچ جاتا ہے قیاس ہے کہ "شبہ" "شہ" کی تحریف شدہ صورت ہے اور "انجن" "آسمان" کی مسخ شدہ قرأت۔ اسی طرح "چرخ" پر اصلاً "چتر" ہونے کا گمان ہے۔ تصرفات کاتب یا ناقل کے ان امکانات کو تسلیم کر لیا جائے تو دوسرے مصرعے کی قرأت بطور ذیل ہونی چاہیے:

شہ آسمان چتر انجم سپاہ

(۱۰) محب امت و مخلص شہنشاہ را　　بود جانشین نعمۃ اللہ را (ص ۳۷ / س ۱۰)

پہلے مصرعے میں "امت" بے مورد واقع ہوا ہے۔ اس سے مصرع ناموزوں اور شعر بے معنی ہو گیا ہے۔ مقالہ نگار کو شاید اس سقم کا احساس تک نہیں، (کذا) یا اس قبیل کی کسی علامت کا ثبت نہ کیا جانا راقم کے خیال کا موید ہے۔ اگر "امت" کے بجائے "است" لکھ دیا جاتا تو مصرعے کی ناموزونیت بھی رفع

ہو جاتی اور شعر بھی اپنے کھوئے ہوئے مفہوم کو پالیتا۔

(۱۱) بود سال آن ماہ دو پنج و چار دوا ایست یارب کہ باد اہزار (کذا) (ص ۳۸ / س ۳)

یہ "دعا" کا محل ہے "دوا" کا نہیں۔ مقالہ نگار نے (کذا) لکھ کر مفہوم تک اپنے ذہن کی نارسائی کا اعتراف کر لیا ہے۔ "دوا" کو "دعا" سے بدلنے کے بعد اس دعائیہ بیت کا مفہوم یہ ہوگا کہ اس ماہ (یعنی معشوق یا ممدوح) کا سال (یعنی عمر) دو پنج و چار (یعنی چودہ) ہو رہی ہے۔ یارب دعا ہے کہ (اس کی عمر) ہزار سال ہو۔

(۱۲) فرس بر مدد و مہر بر می کند بہر مہ مہے دگر می کند (کذا) (ص ۳۸ / س ۴)

شعر کے درست نہ ہونے کے اظہار کی علامت (کذا) موجود ہے۔ اگر مقالہ نگار[1] صرف ایک دو حرفی لفظ کو درست پڑھ لیتے تو انہیں (کذا) لکھنے کی ضرورت پیش نہ آتی۔ پہلے مصرعے میں "مہ" کو "مد" لکھنے کا ذمہ دار کاتب نسخہ ہے یا خود مضمون نگار ہیں، وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم مضمون نگار تھوڑا سا غور و فکر سے کام لیتے تو انہیں مفہوم یا شعر کی درست قرأت تحریر کرنے کے سلسلے میں اعتراف عجز کی صورت پیش نہ آتی۔ پہلے مصرعے کی درست قرأت درج ذیل ہے:

فرس بر مہ و مہر بر می کند

یعنی وہ گھوڑے کو چاند اور سورج پر لے جاتا ہے۔

(۱۳) بتاریخ نو صد دو کم در شمار چپ و راست صد فتنہ گشت آشکار (کذا) (ص ۳۸ / س ۵)

"نہ" کو "نو" لکھنے کا سہو غالباً مضمون نگار سے سرزد ہوا ہے۔ موصوف کی

[1] معارف کے کاتب کی غلطی ہے، مقالہ نگار نے صحیح لکھا تھا۔ (معارف)

نظر میں یہ شعر بھی درست نہیں۔ اگر "نہ" کو "نو" نہ لکھا جائے تو وہ قطعی درست ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ جب سال نو سو میں دو کی کمی تھی (یعنی جب سال ۸۹۸ھ تھا) تو دائیں اور بائیں (یعنی ہر طرف) سینکڑوں فتنوں نے سر اٹھایا۔

(۱۴) بملک دکن قصہ رو نمود کہ جز قصد جان غریبان بود (ص ۳۸ / س ۷)

"غریبان بود" کے بجائے "غریبان نبود" چاہیے۔ "قصہ" کو "قصہ ای" لکھنا بہتر ہوتا۔

(۱۵) خبر بر خبر دین چنین بازگشت کہ از شاہ چیزی نشاید نہفت (ص ۳۸ / س ۱۴)

مضمون نگار کی نظر میں یہ شعر درست ہے، حالانکہ مصرع اول کے دو لفظ اس طرح مسخ ہوئے ہیں کہ مصرعے کا مفہوم بھی خبط ہو گیا ہے۔ علاوہ بریں "گشت" اور "نہفت" ایک دوسرے کے قافیے بھی نہیں۔ پھر بھی مضمون نگار شعر کے آخر میں (کذا) نہیں لکھتے۔ راقم پورے وثوق کے ساتھ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہے مصرع اول اپنی اصل صورت میں یوں ہے:

خبر بر خبر این چنین باز گفت

(خبر بر: خبر لے جانے والا۔ قاصد) دوسرا مصرع قاصد کے بیان کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس کے بعد درج ذیل ابیات ہیں:

(۱۶) رعیت مریضند و شاہان طبیب بدست طبیبان دوائے غریب (ص ۳۸ / س ۱۵)
شود سرخ، رو ہائے زرد از طبیب شاید نہان داشت درد از طبیب (س ۱۶)

دوسرے شعر کے مصرع ثانی کا پہلا لفظ "شاید" درست نہیں۔ وہاں "نشاید" چاہیے۔ ممکن ہے یہ سہو کاتب[1] ہو۔

[1] جی ہاں۔ (معارف)

منقولہ بالا دونوں ابیات کے مفہوم کا ماحصل مقالہ نگار اس طرح بیان فرماتے ہیں:

"عیانی کا قول ہے کہ بادشاہ اپنی رعایا کا معالج ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیمار اور کمزور رعایا کا خیال رکھنا چاہیے۔" (ص ۳۸)

یہ عیانی کا قول نہیں ہے بلکہ یہ باتیں قاصد کی زبانی کہلوائی گئی ہیں۔ ان کا مطلب بھی مضمون نگار نے غلط بیان کیا ہے۔ ان کے بقول رعایا کی بیماری سے باخبر رہنا بادشاہ کا فرض ہے جبکہ منقولہ بالا اشعار سے مستفاد ہونے والے مفہوم کے مطابق یہ رعیت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی بیماری سے بادشاہ کو لاعلم نہ رکھے: "کہ از شاہ چیزی نشاید نہفت" (کہ بادشاہ سے کوئی بات پوشیدہ رکھنا مناسب نہیں)

(۱۷) جہوش ا نغلتے عجب کردہ اند بجو دروز رسے روشن چو شب کردہ اند (ص ۳۹ س ۴)

دوسرے مصرعے میں "روزے روشن کے بجائے" روز روشن" انسب[1] ہے۔

(۱۸) بجمعی پریشان ہم جنس خویش یکی گشتہ وگشتہ از دین خویش (ص ۳۹ س ۶)

دوسرا مصرع سقیم اور ناقابل فہم ہے مگر (کذا)، یا اس قسم کی کسی علامت سے اس کے مسخ شدہ ہونے کی جانب اشارہ نہیں کیا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مضمون نگار نے اس شعر کے سلسلے میں نقل مطابق اصل کے اصول کو اپنایا ہے۔ اگر یہ قیاس درست نہیں ہے تو پھر دوسرے مصرعے میں "کیش" کو "خویش" سے بدلنا ان کا اپنا تصرف ہوگا۔ دوسرا مصرع اس طرح ہونا چاہیے: یکی گشتہ وگشتہ از دین وکیش

شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کی ایک منتشر جماعت کے ساتھ ایک ہوگیا

---

[1] مقالہ نگار نے صحیح لکھا تھا، کاتب کی غلطی ہے۔ (معارف)

(جاملا) اور اپنے دین وکیش سے منحرف ہوگیا۔

(۱۹) ز طوق غلامی دگر گشتہ اند ز شاہ فلک جاہ برگشتہ اند (ص ۳۹ س ۷)

پہلا مصرع "دگر" کے بجائے" بدر" کا متقاضی ہے۔ یعنی وہ غلامی کے طوق سے باہر ہوگئے ہیں (آزاد ہوگئے ہیں) اور فلک مرتبہ بادشاہ سے برگشتہ ہوگئے ہیں۔

(۲۰) کہ مارا حکومت دہ دکن بزرگ اگر تاج خواہی بکن ترک ترگ (کذا) (ص ۴۰ س ۱۲)

اس شعر کے آخر میں (کذا) لکھ کر اس کے مسخ شدہ یا ناقابل فہم ہونے کی جانب اشارہ کیا گیا ہے لیکن اس کا مفہوم ان الفاظ میں تحریر کیا گیا ہے:

"اس مرد ورنے بادشاہ کے ساتھ سخت کلامی کی جرأت کی اور پیغام بھیجا کہ دکن کی سلطنت اسے تفویض کی جائے۔" (ص ۴۰)

اگر دکن کی سلطنت تفویض کرنے کی بابت اسی شعر کی بنیاد پر کہی گئی ہے تو یہ بوالعجبی اور درست شعر کو غلط پڑھنے کی مثال ہے۔ فاضل محقق اور مضمون نگار نے "حکومت دہ" کے فوراً بعد آنے والے "واو" کو "دال" پڑھ لیا اور اسے "کہ دن" کے "کُن" سے ملاکر "دکن" بنا دیا۔ اگر ان کی قرأت کے مطابق مصرعے کو وزن میں پڑھنے کی کوشش کی جائے تو دکن کا "کاف" مشدد ہو جاتا ہے۔ یہ صحیح تلفظ دَکَن ہے نہ کہ دَکّن یہ لفظ بزرگ کے ساتھ اور مضحکہ خیز بن جاتا ہے۔ مصرعے کی درست قرأت ملاحظہ فرمائیں:

کہ مارا حکومت دہ و کُن بزرگ

دوسرے مصرعے کے قافیے "ترک" کو "ترگ" بنا دینا مزید سہو ہے۔ دراصل وہ اس سلسلے میں تشکیک کے شکار رہیں۔ شعر کے آخر میں (کذا) کا ثبت کیا جانا اس قیاس کا موید ہے۔ زیر تبصرہ مضمون میں درج ذیل شعر بھی نقل کیا گیا ہے جس کے

قوافی "بزرگ" اور "ترک" ہیں۔ ملاحظہ ہو:

چنان خواہرش ساخت سلطان بزرگ　　کہ باشد بفرمانش ہندو و ترک (ص ۵۱)

اس طرح کے قریب المخرج حروف کے حامل الفاظ کو قوافی کے طور پر باندھنا ممنوع نہیں بلکہ اس کا شمار قوافی کے عیب میں ہوتا ہے اور علم قافیہ کی اصطلاح میں اسے اِکفا کہتے ہیں۔

(۲۱) فرزندن بود شانِ لشکر از دہ ہزار (ص ۱۴ / س ۳)

ضمیر "شان" کے ساتھ اضافت زاید اور غیر ضروری ہے[۱] وہ مصرعے کو بھی ناموزوں بنا رہی ہے اور مفہوم کو بھی غارت کر رہی ہے۔

(۲۲) ولیکن دو سردار کہ نزدیک بود　　رسیدند بادشاہ جان بخش زود (ص ۱۴ / س ۶)

شعر مہمل بھی ہے اور ناموزوں بھی مگر مضمون نگار کی نظر میں شاید درست ہے، کیونکہ (کذا) یا اس قبیل کی کسی علامت کے ذریعے اس کی مسخ شدگی کا اظہار نہیں کیا گیا[۲]

(۲۳) جیوش حبوش سیہ دل چو میغ　　کشیدند بر لشکر شاہ تیغ (کذا) (ص ۱۴ / س ۱۱)

شعر قطعی طور پہ درست اور واضح ہے مگر شعر کے آخر میں (کذا) کی موجودگی ثبوت ہے اس امر کا کہ مضمون نگار کے ذہن کی رسائی شعر کے مفہوم تک نہیں ہو پائی۔ شعر کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیں:

" بادل جیسا سیاہ دل رکھنے والے حبشیوں کے لشکروں نے بادشاہ کے لشکر پر تلوار سونت لی"

---

[۱] یہ بھی کاتب کی غلطی ہے [۲] مقالہ نگار نے دوسرے مصرعہ میں بادشاہ کے بجائے باشاہ لکھا تھا، بادشاہ کاتب کی غلطی ہے۔

(۲۴) بصف در دلیران چودہ کردہ اند　　چہ گویم کہ شیران چپا کردہ اند (ص ۴۶ / س ۳)

مصرع اولی میں "چودہ" محل نظر اور مہمل ہے۔ اس پہ حاشیے کی علامت (۱) لگا کر حاشیے میں صرف "چودہ" لکھ دیا گیا ہے[۱]۔ اس سے مضمون نگار کا مقصد کیا ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔ شعر کے دونوں مصرعوں کا اختتام "کردہ اند" پہ ہوتا ہے۔ اگر یہ ردیف ہے تو لازما قوافی بھی ہونے چاہئیں لیکن "کردہ اند" سے پہلے مصرع اولی میں "چودہ" ہے اور مصرع ثانی میں "چپا"۔ یہ دونوں لفظ ہم قافیہ نہیں۔ شعر کے آخر میں (کذا) بھی ثبت نہیں۔ غالباً مضمون نگار اس شعر کی موجودہ قرأت کو درست تسلیم کرتے ہیں اور قوافی کے عیب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

قرین قیاس یہ ہے کہ "چودہ" خود "چپا" کی مسخ شدہ صورت ہے۔ اگر اس کی تصحیح کر لی جائے تو دونوں مصرعوں میں "چپا" ردیف کا جزو بن جاتا ہے اور "دلیران" اور "شیران" قوافی قرار پاتے ہیں۔ شعر کی تصحیح شدہ صورت ملاحظہ فرمائیں:

بصف در دلیران چپا کردہ اند　　چہ گویم کہ شیران چپا کردہ اند

(۲۵) حکومت بعدل آنچنان می کند　　کہ ویرانی ہا را جنان می کند (ص ۴۶ / س ۶)

دوسرے مصرعے میں "ویرانی ہا" کے بجائے "ویرانہ ہا" (ویرانہا) مرجح ہے کیونکہ ویرانی ایک حالت ہے جبکہ ویرانہ غیر آباد اور اجاڑ جگہ کو کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے "ویرانے کو جنت بنانا"، کہنا زیادہ درست ہے "ویرانی کو جنت بنانا" کہنے سے۔

---

[۱] مقالہ نگار نے متن میں "چراہ" اور حاشیہ میں چودہ لکھا تھا کاتب نے متن میں بھی "چودہ" کر دیا (معاف)

(۲۶) ہمیشہ بہجۃ الملک کامش بود　　　ازان بہجۃ الملک نامش بود　(ص ۴۶، س ۱۸)

پہلا مصرع ناموزوں ہے مگر مقالہ نگار کی نظر میں درست ہے کیونکہ انھوں نے شعر یا مصرعے کے آخر میں اس کی ناموزونیت کے اظہار کے لیے (کذا) یا کوئی اور علامت ثبت نہیں کی۔ شعر کا پہلا لفظ دراصل "ہمہ" کی مسخ شدہ صورت ہے۔ اصل مصرع ہے ع ہمہ بہجۃ الملک کامش بود

(۲۷) بخواہید خان جہانش بنام　　　بگوئید جان جہانش تمام　(ص ۴۷، س ۴)

پہلے مصرعے کا ابتدائی لفظ "بخواہید" محل نظر ہے۔ اسے "بخوانید" بنانے سے شعر کے معنوی سقم کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ قیاس ہے کہ "خواندن" کے معروف معنی (پڑھنا) کے پیش نظر "بخواہید" کی قرأت کو ترجیح دی گئی ہے۔ خواندن کے معنی (پڑھنا کے علاوہ) طلب کرنا، بلانا، پکارنا کے بھی ہیں۔ موخر الذکر معنی کی تائید میں سیاست نامہ (تالیف نظام الملک طوسی) کا درج ذیل جملہ ملاحظہ فرمائیں:

"چنین گویند کہ بہرام گور را وزیری بود او را راست روش خواندندی"[1]

خواجہ حافظ شیرازی کے درج ذیل شعر میں "خواندن" (بصیغہ امر) طلب کرنا کے معنی میں آیا ہے:

چو مہمان خراباتی بعزت باش با رندان　　　خیر نہان برای رضای خدا کنند[2]

لہذا مصرعے کی درست ترین قرأت یہ ہے:

بخوانید خان جہانش بنام

[1] سیاست نامہ، نیشنل پریس الہ آباد: ص ۱۷ [2] دیوان حافظ از روی نسخہ محمد قزوینی، دکتر قاسم غنی: ص ۷۰۔

(اسے خانِ جہاں کے نام سے نہ پکارو)

(۲۸) کسان را قلعہ ہای جادا شتند　　　بسے خوف واندک رجادا شتند　(ص ۴۸، س ۲)

پہلا مصرع مہمل ہے اور اس میں لفظ "قلعہ" بہ وزن صلہ آیا ہے جبکہ اس کا درست تلفظ قَلْعَہ (بروزن دَفْعَہ) ہے۔ تقطیع میں اس کا ہائے مختفی ساقط ہو کر فتحہ کی خفیف سی حرکت بن کر رہ جاتا ہے۔ مثلاً درج ذیل مصرعے ملاحظہ ہوں جو زیر تبصرہ مضمون سے نقل کیے جاتے ہیں:

۱۔ برون آمد از قلعہ فریاد و آہ　(ص ۴۸)

۲۔ بسی نان و نعمت دران قلعہ بود　(ایضاً)

۳۔ در قلعہ را ساخت نیزہ کلید　(ایضاً)

مضمون نگار نے مصرعے کے بارے میں کوئی اشارہ نہیں کیا ہے اس لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا حق بجانب ہوگا کہ ان کی نظر میں یہ مہمل مصرع درست ہے۔ مصرعہ اس طرح ہونا چاہیے:

کسانیکہ در قلعہ جادا شتند

اس مصرعے کے منشائے مصنف کے عین مطابق ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن دوسرے مصرعے کا مزاج کسی ایسے ہی مصرعے کا متقاضی ہے۔ یہ بھی خارج از امکان نہیں کہ شاعر نے یہی مصرع کہا ہو۔

(۲۹) ز بربادی اول بجنگ آمدند　　　ز کم آبی آخر بہ تنگ آمدند　(ص ۴۸، س ۱۲)

اس شعر کو ماقبل شعر کے مفہوم کی روشنی میں دیکھا جائے۔ عیانی کے بقول قلعے میں "نان و نعمت" کی فراوانی تھی لیکن پانی صرف آنکھوں سے نکلتا تھا۔ اس

پس منظر میں زیر نظر شعر کے مصرع اول کا لفظ "بر بادی" قطعی بے مورد، بے محل اور مہمل ہے۔ میرے فاضل دوست بادنیٰ تامل اسے "پُر بادی" (حوصلہ و ہمت) بنا کر شعر کے معنوی سقم کا ازالہ کر سکتے تھے۔ پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ شاعر نے "کم آبی" کی لفظی رعایت ملحوظ رکھتے ہوئے "پُر بادی" ہی نظم کیا ہوگا، مگر مضمون نگار نے نقل مطابق اصل پر اکتفا کرنا ہی کافی سمجھا اور مفہوم کے غارت ہونے کی کوئی پروا نہیں کی۔ تصحیح کے بعد شعر کیا سے کیا ہوگیا، ملاحظہ فرمائیں:

ز پُربادی اول بجنگ آمدند — ز کم آبی آخر بتنگ آمدند

(۳۰) بکش بال مائے کش تیغ تیز — غلامان خود را مکش از سیتز (کذا) (ص ۴۹ / س ۸)

"مائے" (مالی) کی جگہ کوئی اور لفظ رہا ہوگا۔ شاید کوئی ضمیر۔ اس سے قطع نظر دوسرے مصرعے کا قافیہ "سیتز" (؟) ملاحظہ فرمائیں۔ اسے پہلے مصرعے کے قافیے کی روشنی میں نہایت آسانی کے ساتھ "ستیز" بنایا جا سکتا تھا[1] ع

غلامان خود را مکش از ستیز (تو اپنے غلاموں کو دشمنی سے قتل نہ کر)

(۳۱) اگر شاہ این جرم بخشند چہ باک (ص ۴۹ / س ۱۱)

مضمون نگار کو "بخشند" کی دال کے سقوط کا شاید احساس نہیں ہوا۔ "بخشند" کو "بخشد" لکھنے سے مصرع اس عیب سے پاک ہو جاتا ہے۔

(۳۲) ببر بال خود را سلامت بدر — دگر ہم ببخشم بہ روح بدر (ص ۴۹ / س ۱۴)

یہ نقل مطابق اصل کی ایک اور مثال ہے۔ مصرع ثانی کے آخری الفاظ "روح بدر" نہیں، "روح پدر" ہیں۔ کوئی اوسط درجے کا فارسی داں بھی اسے "روح پدر" ہی

۱؎ مقالہ نگار نے صحیح لکھا تھا، سہو کاتب ہے (معارف)

پڑھے گا۔

(۳۳) چو زاغ سیہ صدشہ باز گشت — ز ساغر فرحناک شد باز گشت (ص ۵۰ / س ۵)

پہلے مصرعے میں "صید" (بجائے صد) ہونا چاہیے[1] ورنہ مصرع وزن اور معنی دونوں سے محروم رہے گا۔ "شہ باز" کو ملاکر "شہباز" لکھا جاتا تو بہتر تھا۔ دوسرے مصرعے میں "شد" دراصل "شہ" کی تحریف شدہ صورت ہے۔ شد کو برقرار رکھنے کی صورت میں اس کا فاعل "زاغ سیہ" قرار پائے گا اور شعر کا مطلب یہ ہوگا کہ جب زاغ سیہ شہباز کا شکار ہوا تو وہ "ساغر"[2] سے فرحت اندوز ہوا اور لوٹ گیا۔ اس سے زیادہ لغو کوئی اور بات ہو سکتی ہے کہ شہباز کے ہاتھوں شکار ہونے والا "زاغ سیہ" (کالا کوا) ساغر سے فرحت اندوز ہو کر لوٹ جائے؟ اب "شد" کو "شہ" سے بدلنے کے بعد مفہوم ملاحظہ ہو:

"جب زاغ سیہ (باغی وزیر) شہباز (محمود شاہ بہمنی) کا شکار ہو گیا تو ساغر سے سرشار بادشاہ (قلعہ ساغر سے) لوٹ گیا"۔

اس نے وہاں سے بیدر کا رخ کیا جہاں اس کے پُرجوش استقبال کی تیاریاں مکمل تھیں۔ اس تصحیح سے تجنیس مرکب کا حسن (شہباز ۔ شہ باز) بھی بحال ہو جاتا ہے جو مضمون نگار کی تحریر کردہ قرأت میں زائل ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ قافیے کا عیب بھی جا رفع ہو گیا۔

(۳۴) شد از مقدم شاہ فرخندہ فر — مشرف بہ تشریف دیدار و در (ص ۵۰ / س ۱۳)

۱؎ یہ بھی سہو کاتب ہے (معارف) ۲؎ ساغر قلعے کا نام ہے۔ یہاں ایہام کا حسن پیدا کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔

مصرع اولیٰ میں "شاہ" (بجائے شا) ہونا چاہیے۔ یہ شاید سہو کاتب ہو۔ مصرع ثانی میں مضمون نگار نے "دیوار و در" کو "دیدار و در" پڑھ لیا۔ "دیدار" کو "دیوار" سے بدلنے کے ساتھ ہی "تشریف" کے بعد لٹا کاما (،) لگانے سے مصرع آخر کو درست پڑھنے میں آسانی ہوگی۔

(۳۵) شود ملک بیدر چو خلد برین　　دہر جملہ دلہا گواہی برین (ص ۵۱ س ۱)

"دہر"[۱] کو "دہر" پڑھا جائے ——— دہر جملہ دلہا گواہی برین

(۳۶) چنان جنگی دل شکستہ نواخت　　کہ بر چنگ زد رشتہ را نارساخت (کذا) (ص ۵۲ س ۲)

آخر میں (کذا) لکھ کر شعر کے نادرست اور ناقابل فہم ہونے کا اظہار کیا گیا ہے۔ پہلا مصرع اپنی موجودہ صورت میں ناموزوں ہے۔ جنگی فی الحقیقت چنگی (چنگ بجانے والا) ہے جسے یائے وحدت کے ساتھ "چنگیی" لکھا جانا چاہیے ——

چنان چنگیی دل شکستہ نواخت

(۳۷) زنائے زرین نے زنان نے زدند　　حریفان زسیمنین قدح مئی زدند (ص ۵۲ س ۸)

"سیمنین" غالباً "سیمین" کی مسخ شدہ صورت ہے[۲]۔ "مئی" مصرعے کے وزن کو متاثر کر رہا ہے۔ اسے "مَی" پڑھا جائے۔ "زرّین" کو "زرین" (بلا تشدید) غالباً شاعر نے باندھا ہے۔

(۳۸) چو گفتم ز آوارۂ بذل او　　در آئیم ز در روانۂ عدل او (ص ۵۲ س ۱۴)

مصرع اولیٰ میں "آوارۂ بذل" لغو اور بے معنی ہے۔ "ز" پر ایک نقطے کے اضافے سے مصرع درست اور جملہ اسقام سے پاک ہو جاتا ہے۔ مصرع ثانی میں

[۱] مقالہ نگار نے "دہر" لکھا تھا، کاتب نے اسے دہر کر دیا (معارف)۔ [۲] کاتب کی غلطی سے تصرف ہوا ہے (معارف)

"در آئیم" کو "در آیم" سے بدل دیں تو مصرعے کی بے موزونیت دور ہو جاتی ہے۔ شعر کی صحیح قرأت یہ ہے:

چو گفتم ز آوازۂ بذل او　　در آیم ز دروازۂ عدل او

(۳۹) ز عدلش شبان بیرہ را شیر شیر　　دہد آن قدر کہ منبود شیر سیر (کذا) (ص ۵۲ س ۱۶)

یہ شعر ان تین شعروں میں شامل ہے جن کے بارے میں مضمون نگار رقمطراز ہیں:

"بادشاہ کے عدل و انصاف کے بارے میں عیانی کی خوش بیانی ملاحظہ کیجئے"۔

اب شعر کے آخر میں (کذا) پر توجہ فرمائیے۔ جو شعر مسخ شدہ ہو یا فہم کی گرفت میں نہ آسکا ہو اسے "خوش بیانی" کی مثال میں پیش کرنا کہاں تک درست ہے؟ یہ شعر اور خصوصاً اس کا مصرع ثانی کچھ کاتب اور بہت کچھ مضمون نگار کی تحریفوں سے اس طرح مسخ ہوا ہے کہ مدعا عنقا ہو کر رہ گیا ہے۔ تاہم بعض رہنما اور کلیدی نوعیت کے الفاظ اپنی اصل صورت میں موجود ہیں، ان کی مدد سے "مدعا" کی بازیافت کی کوشش کی جاتی ہے۔

قیاس ہے کہ پہلے مصرعے میں "بیرہ" مضمون نگار کے نزدیک "تیرہ" ہے۔ "تا" کے نقطے مسودے کی نقل تیار کرتے وقت یا مضمون کی کتابت کے دوران قلم انداز ہو گئے ہوں گے۔ ظن غالب ہے کہ مضمون نگار نے "تیرہ" کو "شبان" کی صفت قرار دیا ہوگا۔ "بیرہ" کے دو نقطے راقم کے گمان کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ اگر امر واقعہ یہی ہے تو اس مسخ شدہ شعر میں "عیانی کی خوش بیانی" صرف مضمون نگار ہی کو نظر آ سکتی ہے[۱]۔

[۱] مقالہ نگار نے صحیح برّہ ہی لکھا تھا، کاتب نے غلطی سے برہ (بلا تشدید) لکھا تھا اور معارف میں برّہ کے بجائے برہ ہی چھپا ہے اس لیے تنقید نگار کا قیاس غلط ہے (معارف)

"شبان" شب کی جمع نہیں کہ اسے "تیرہ" کا موصوف قرار دے کر "شبانِ تیرہ" پڑھا جائے۔ "شبان" مفرد لفظ ہے جس کے معنی ہیں "چرواہا"[1] "بیرہ" (یا تیرہ) دراصل "برہ" (یعنی بکری کا بچہ) کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مصرعِ اول میں پہلا "شیر" دودھ کے معنوں میں ہے اور دوسرے "شیر" سے مراد معروف درندہ ہے۔ پہلا شیر مضاف ہے اور دوسرا مضاف الیہ اور دونوں کا تلفظ یائے معروف کے ساتھ بروزن "تیر" ہے۔

دوسرے مصرعے میں "بنبود" پر "شود" کی مسخ شدہ صورت ہونے کا گمان ہے (بلکہ "شود" قرینِ صحت نظر آتا ہے۔) اب شعر کی صحیح تر قرأت اس طور پہ ہوگی:

زعدلش شبان برہ را شیرِ شیر دہد آن قدر کہ شود شیر سیر[2]

ترجمہ: اس کے انصاف (کے فیض) سے چرواہا بکری کے بچے کو شیر کا دودھ اس قدر پلا دیتا ہے کہ شیر پر تھکن اور نقاہت طاری ہو جاتی ہے۔

(۴۰) شہا تخت و ملک از تو راستی ترا می رسد سلطنت راستی (کذا) (ص ۵۲ / س ۹)

---

[1] انوری کا ایک شعر سند میں پیش کیا جاتا ہے:

انصاف بدہ تا در انصافِ تو باز است غمخوار ترا از گرگ شبان نیست غنم را

[2] لفظ "سیر" مجازاً تھکنے کے معنوں میں آتا ہے۔ اس کا تلفظ بھی فارسی میں "شیر" کی طرح بروزن تیر ہے۔ سعدی نے اسے "چیر" (ظفر مند، غالب) کے قافیے میں باندھا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

ملک را بود بر عدو دست چیر کہ لشکر دل آسودہ باشند و سیر (بوستان چاپخانہ زیبا...)

پہلا مصرع ناموزوں ہے۔ ایک لفظ ("نو") خود مضمون نگار کی تحریف کا شکار ہو کر "تو" بن گیا۔

اس شعر کو تاریخی واقعات کی روشنی میں نہایت آسانی کے ساتھ خفیف سی اصلاح کر کے درست اور منشائے مصنف کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔ جنگ و جدل کے دوران بادشاہ کی توجہ دشمنوں پر مرکوز تھی۔ ملک کا نظم و نسق درہم برہم ہو چکا تھا۔ دشمنوں کے استیصال کے بعد جب اسے اطمینان ہوا تو اس نے "تخت و ملک" کو از سرِ نو آراستہ کیا۔ اس طرح پہلے مصرعے کی اصح صورت یہ ہونی چاہیے: ع شہا تخت و ملک از نو آراستی "نو" بجائے "تو" اور "آراستی" بجائے "راستی" لکھنے سے شعر کے جملہ اسقام دور ہو جاتے ہیں۔ یقیناً شاعر نے یہ مصرع اسی طرح کہا ہوگا۔

(۴۱) نوشتم در اوصاف شہ نامۂ کہ باشد ز انصاف شہ نامۂ (ص ۵۳ / س ۱۶)

دونوں مصرعوں میں "شہ نامہ" کے ساتھ یائے وحدت یا اس کے قائم مقام ہمزہ لگانا ضروری ہے[1]۔ اسے شہ نامہ ای یا شہ نامہ یی یا شہ نامہ ی یا شہ نامۂ لکھنا چاہیے تھا۔

(۴۲) نہ دُر جست این نامہ یا دفتریست کہ ہر صفحہ درج پہ گوہریست (ص ۵۳ / س ۱۷)

مصرع ثانی ناموزوں ہے۔ "ہر صفحہ" کے بعد "زین" (مخففِ از این) یقیناً رہا ہوگا جو کاتب نسخہ یا ناقل یا مضمون نگار یا کاتب مجلہ[2] معارف کے سہو سے

---

[1] کاتب کی غلطی ہے، مقالہ نگار نے ہمزہ لکھا تھا (معارف) [2] کاتب کا سہو نہیں ہے۔ (معارف)

ساقط ہوگیا۔ صحیح مصرع یہ ہے :

کہ ہر صفحہ زرین، درج پر گوہریست

(۴۳) سخن چون شاخ زبان سرکند لبالب دہان پر ز شکر کند (ص ۵۴/س ۱)

پہلے مصرعے میں "شاخ" سے پہلے "از" کا مخفف "ز" چاہیے۔ اس کے بغیر مصرع نہ وزن کے لحاظ سے درست ہوگا نہ معنی کے اعتبار سے۔

(۴۴) کیم من کہ این ہا توانم سرود زغیب آید این ہا بجانم فرود (ص ۵۴/س ۱۰)

آخر میں (کذا) کا نہ لکھنا ظاہر کرتا ہے کہ مضمون نگار کی نظر میں یہ شعر درست ہے۔ انھوں نے قوافی پر توجہ کی ہوتی تو "فرود" کے قافیے میں "سرود" نقل نہ فرماتے[1] خواہ وہ نسخے کے مطابق ہی کیوں نہ ہوتا۔ علاوہ برین اسی مصرعے میں ایک فعل معاون "توانم" بھی موجود ہے جو اصل فعل کے بغیر ادھورا اور بے معنی ہے۔ اسے "سرود" کی جگہ پر زمانۂ ماضی مطلق کے صیغہ واحد غایب میں اصل فعل درکار ہے۔ اگر "سرود" کو "سرود" بنا دیا جائے تو پہلے مصرعے کو "فرود" کا قافیہ اور فعل معاون "توانم" کو اصل فعل بھی مل جاتا ہے اور معنی کے اعتبار سے شعر بھی مکمل ہو جاتا ہے۔

(۴۵) صفحہ نمبر ۵۴ پر ایک ہی شعر دو جگہ دو مختلف قرأتوں کے ساتھ نقل کیا گیا:

چو کلکم بکافور بر مشک سود زدم خاک تیرہ بچشم حسود (س ۹)

چو کلکے بکافور بر شک سود زدم خاک تیرہ بچشم حسود (س ۱۸)

شعر کی پہلی قرأت درست ہے۔ قیاس ہے کہ موخر قرأت میں مضمون نگار نے

[1] مقالہ نگار نے صحیح لکھا تھا۔ (معارف)

"حسود" کی مناسبت سے "بر مشک" کو "بر شک" بنایا ہوگا۔

شروع میں عرض کیا جا چکا ہے کہ راقم الحروف نے تبصرہ کے لیے منتخبہ اشعار نقل کرنے میں ان کا وہی املا برقرار رکھا ہے جسے مضمون نگار نے اختیار کیا ہے، تاکہ راقم الحروف تحریف و تصرف کے الزام سے بری رہے۔ مضمون نگار نے یائے وحدت، یائے تخصیص، یائے تعمیم، یائے نسبت، یائے اضافت وغیرہ پر ختم ہونے والے الفاظ کی کتابت میں یکسانیت کا قطعی لحاظ نہیں رکھا ہے۔ کسی لفظ کو یائے معروف کے ساتھ لکھا ہے اور کسی کو یائے مجہول کے ساتھ۔ مضمون میں ایسے اشعار بھی شامل ہیں جن میں حرف "یا" کی دونوں صورتیں (ی۔ے) پائی جاتی ہیں۔ مثلاً

زنائے زرین نے زنان نے زدند حریفان زسیمین قدح می زدند[1] (ص ۵۲)

سطور ذیل میں یائے معروف اور یائے مجہول کے ساتھ تحریر کردہ الفاظ کے حامل مصرعے نمونتاً پیش کیے جاتے ہیں تاکہ "دعویٰ بے دلیل نہ ہو":

(۱) یائے مجہول کے ساتھ نقل شدہ الفاظ کی مثالیں :

(۱) عیانی گرچہ بے نانم، نہ آنم (ص ۳۲)

(۲) بہر مہ مہے دگر می کند (ص ۳۸)

(۳) چہ گویم یکے از لکے گفتہ ام (ص ۵۲)

(۲) یائے معروف کے ساتھ تحریر کردہ الفاظ کی مثالیں :

(۱) یکی چہ باشد اگر خوانیش بلطف تمام (ص ۳۲)

[1] می کو بھی مضمون نگار نے "مئی" لکھا ہے۔

(۲) مجمعی پریشان ہم جنس خویش (ص ۳۹)

(۳) شجاعیٓ، کرمیٓ، ہنرپروریٓ (ص ۴۰)

ہمزہ کے استعمال میں اسراف سے کام لیا ہے۔ جہاں کہیں یاے اضافت بشکل مجہول لکھی گئی ہے اس پر ہمزہ بالالتزام لگایا گیا ہے حالانکہ اس کی چنداں ضرورت نہیں. چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں :

(۱) بدست طبیبان دوائے غریب (ص ۳۸)

(۲) شود سرخ روہائے زرد از طبیب (ص ۳۸)

(۳) کرم ہائے شہ کاندکے گفتہ ام (ص ۵۲)

ہاے مختفی پر مختتم ہونے والے الفاظ میں تعمیم، تخصیص یا وحدت کا پہلو پیدا کرنے کے لیے قدیم طرز املا کے مطابق ہاے مختفی پر ہمزہ لکھنے کی روایت رہی ہے۔ جیسے اقبال کے درج ذیل مصرعے میں :

موج ز خود رفتۂ تیز خرامید و گفت

مگر جدید املا میں اس کے لیے تین صورتیں رائج ہیں :

(۱) "ای" بجاے ہمزہ جیسے موج ز خود رفتہ ای ....

(۲) "یِ" بجاے ہمزہ جیسے موج ز خود رفتہ یِ .....

(۳) "ی" بجاے ہمزہ جیسے موج ز خود رفتہ ی

موخر صورت راقم الحروف کی نظر میں انسب اور قابل ترجیح ہے کیونکہ یہ فن تاریخ گوئی میں ہمزہ کا عدد (۱۰) محسوب کرنے کے اصول سے بھی مطابقت رکھتی ہے۔ مضمون نگار ان صورتوں میں سے کس کو ترجیح دینے کے حق میں ہیں؛

دی جائیں لیکن مضمون میں انھوں نے ایک شعر نقل کرتے ہوئے مذکورہ بالا چاروں صورتوں کو نظر انداز کر دیا ہے جس کی وجہ سے وہ شعر ایک اور ہی وزن میں جا پڑا ہے ملاحظہ فرمائیں :

نوشتم در اوصاف شہ نامہ که باشد ز انصاف شہ نامہ

ان مصرعوں کا وزن — فعولن فعولن فعولن فع — ہے اور تقطیع — نوشتم / در اوصا / فِ شہ نا / مہ = کہ باشد / ز انصا / فِ شہ نا / مہ — ہے۔ اس مثنوی کی بحر متقارب مثمن مقصور / محذوف اور ارکان — فعولن فعولن فعولن / فعل — ہیں۔ منقولہ بالا شعر کے چوتھے اور آٹھویں رکن میں ایک سبب کی کمی یاے وحدت یا ہمزہ[۱] کے اضافے سے پوری کی جا سکتی ہے۔ شعر کی درست قرأت یوں ہے :

نوشتم در اوصاف شہ نامہ ی که باشد ز انصاف شہ نامہ ی

یہاں عروضی مسائل پر کوئی بحث مقصود نہیں۔ راقم صرف ان غلط قرأتوں کے حامل اشعار کی نشان دہی کرنا چاہتا ہے جنھیں مضمون نگار نے یا تو غلط پڑھ کر نقل کیا ہے یا نسخے سے غلطیوں سمیت اٹھا کر مضمون میں شامل کر لیا ہے۔

---

[۱] پہلے گزر چکا ہے کہ مقالہ نگار نے ہمزہ کے ساتھ لکھا تھا۔ (معارف)

فارسی زبان کے ہندو انشا پرداز

از جناب رام لعل نابھوی صاحب

علم و ادب کسی کی میراث نہیں، ہندوؤں نے اردو و فارسی کی اور مسلمانوں نے برج بھاشا اور سنسکرت کی جو خدمت کی ہے وہ ہندوستان کی علمی تاریخ کا زریں باب ہے، رام لعل نابھوی جیسے یادگار زمانہ لوگ یہ افسانہ کہن سنا کر ہمیں ہماری شاندار روایتوں پر کاربند ہونے کی دعوت دے رہے ہیں لیکن آزاد ہندوستان کے لوگوں کی نظر میں یہ بے وقت کی شہنائی ہے، فارسی کا ذکر کیا؟ ہندوؤں نے اردو کو بھی مسلمانوں کی زبان سمجھ کر اس کے ساتھ جو شدید بیگانگی کا رویہ اختیار کر رکھا ہے اسے ظلم و ناانصافی، تنگ نظری اور علم دشمنی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، نابھوی صاحب کا یہ مضمون ہندی میں بھی چھپے تو ممکن ہے ان لوگوں کی نگاہ سے بھی گزرے جن کو وہ یہ سنانا چاہتے ہیں۔ "معارف"

فن انشا دوسرے فنون کی طرح وسیع اور مختلف النوع ہے اصطلاح میں اس کا اطلاق انشائے نثر اور انشائے کتابت پر ہوتا ہے، پہلے اس کے لغوی معنوں پر نظر ڈالیے :-

انشا : مونث - عبارت لکھنا - کوئی بات دل سے پیدا کرنا - شروع کرنا - طرز تحریر - علم منطق میں وہ کلام جس میں صدق و کذب کا احتمال نہ ہو - وہ کتاب

جس میں قواعد خط و کتابت اور خطوط لکھے ہوں۔

انشا پرداز :- منشی - نثار -

انشا پردازی :- مونث - عبارت آرائی - خط یا عبارت لکھنے کا ڈھنگ - مضمون لکھنے کا طریق -

انشا اور املا میں فرق دیکھئے -

نامۂ جاناں ہے کیا لکھا میری تقدیر کا ۔۔۔ خط کی انشا اور ہے لکھنے کی املا اور ہے (رشک)

وہ کتاب جس میں مختلف خطوط کے نمونے اور خط لکھنے کے قاعدے ہوں جیسے انشائے طاہر وحید - انشائے فائق - انشائے فیض رساں - انشائے فیض بخش - انشائے گلزار اعظم - انشائے دل آویز - انشائے عجیب - انشائے صفیر بلبل - ظہیر الانشا - دستور المکتوبات - رقعات امان اللہ - رقعات مظہری - رقعات عزیزی - رقعات بیدل - رقعات قتیل وغیرہ -

قاتل کو اپنے حال لکھوں گا کہاں تلک ۔۔۔ خط کی جگہ میں بھیج دوں انشا قتیل کی (تسلیم)

انشا کرنا - تحریر کرنا - لکھنا -

خون روتا ہے ہر اک حرف غلط پر ہمدم ۔۔۔ اور اب نگین جیسا تم کہو انشا کروں (انشا)

غرق گرداب یم فکر ہو انشا پرداز ۔۔۔ اے نصیر اپنے دکھاؤں جو میں تقریر کے پیچ (نصیر)

فارسی انشا پردازی کا آغاز سولھویں صدی عیسوی میں ہوا اور سترہویں صدی میں یہ معراج کمال پر پہنچی لیکن اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط میں مغلوں کا زوال شروع ہوا تو فارسی زبان کا رنگ و آہنگ بھی قائم نہ رہ سکا - اگرچہ رقعات و مکاتیب، فرامین و دستاویزات کا سلسلہ فارسی زبان میں ہندوستان کی ریاستوں کے خاتمے تک جاری رہا -

ان نگارشات میں حسن بیان۔ سیاست۔ معاشرت۔ آداب۔ افہام و تفہیم انتباہ۔ ترغیب۔ متانت زبان۔ ایجاز۔ اختصار۔ شگفتگی۔ معجز نگاری۔ آرائش الفاظ و معانی۔ اسلوب کی نزاکت۔ مراسلے کو مکالمہ بنا دینا۔ شوخیٔ تحریر۔ فارسی زبان دانی۔ صرف و نحو۔ محاسن و معائب کلام۔ آداب مناظرہ۔ عقاید و توہمات۔ اصول و ضوابط۔ سادگی و سلاست۔ خیال نامی۔ اصطلاحات نگاری۔ صنایع و بدایع۔ مذہب اور تصوف۔ شریعت اور طریقت۔ القاب و آداب تقطیع۔ تنقید۔ تاریخ گوئی۔ اصلاح کلام۔ واقعہ نگاری۔ سادگی اور پرکاری بھی ملتی ہے۔

ہندو انشا پردازوں کا ذکر یا ان کے کاموں کا تجزیہ کسی الگ کتاب میں نہیں ملتا تاہم مندرجہ ذیل کتب میں ان کا ذکر موجود ہے۔

۱۔ ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ از ڈاکٹر سید عبداللہ ۲۔ تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند۔ پانچویں جلد فارسی ادب سوئم ۱۷۰۷ سے ۱۹۷۲ء پنجاب یونیورسٹی لاہور ۳۔ نوابی عہد کے ہندوؤں کا فارسی ادب میں یوگدان از ڈاکٹر نریند بہادر سریواستو۔

۴۔ چندر بھان برہمن کا ذکر ان کتابوں میں ہے۔

i۔ گلزار بہار از بھگونت رائے بہار سنامی ii۔ احوال و آثار چندر بھان برہمن از ڈاکٹر محمد عبدالحمید فاروقی۔ iii۔ چندر بھان برہمن از خواجہ محمد یونس۔

۵۔ لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی کا ذکر لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی از ساجد زید پوری میں ہے۔

۶۔ پیارے لال الفتی۔ رام نرائن موزوں اور اجاگر چند الفت اور کلیان سنگھ

عاشق کا ذکر عربی۔ فارسی اور علوم اسلامیہ میں بہار کا حصہ۔ مرتبہ سید اطہر شیر (ادارہ تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ) ۷۔ پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ از ظہور الدین احمد۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۸۔ مختلف نسخہ ہائے خطی۔ کیٹلاگ میں ملتا ہے۔

ہندو انشا پرداز مغلیہ دور میں پورے عروج پر تھے۔ وہ مسلمان انشا پردازوں کے شانہ بشانہ۔ محکمہ مال میں مسلمانوں سے بہت آگے۔ فن انشا میں مسلمانوں کے قدم بہ قدم تھے۔ جادو ناتھ سرکار کا کہنا ہے کہ ہندو منشی مسلمان منشیوں سے زیادہ کامیاب تھے۔

اس مختصر مضمون میں انشا پردازوں اور ان کے کاموں کا مکمل احاطہ نہیں ہو سکتا تاہم جو کچھ دستیاب ہو سکا ہے اسے ایک نقشے کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۱	دقایق الانشا	رنچھوڑ داس جونپوری	۱۷۴۰ء کے قریب کی تصنیف ہے اور سات دقیقوں پر بہ تفصیل ذیل مشتمل ہے۔ اول۔ بحث حروف تہجی و اعراب۔ دوم۔ بحث کلمہ (اسم۔ فعل۔ حرف) سوم۔ اصول نثر و نظم۔ چہارم۔ استقام کلام۔ پنجم۔ محاسن کلام۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			ششم قواعد زبان فارسی ہفتم آداب گفتگو۔ آداب مناظرہ۔ آداب ملازمت وغیرہ۔
۲	نگارنامہ منشی	منشی لال چند ملتانی معروف بہ ملک زادہ۔	کتاب کی تالیف کا آغاز ۱۰۹۳ھ اور اختتام ۱۰۹۵ھ میں ہوا اس میں اورنگ زیب کے فرامین۔ امرا۔ شہزادوں اور ان کی بیگمات کے مکتوبات اور خود مولف اور دوسرے منشیوں کے ذاتی خطوط مندرج ہیں۔ یہ کتاب نہایت اہم دستاویزات کا مجموعہ ہے جو نولکشور پریس میں ۱۸۸۲ء میں چھپی۔ بڑے سائز کے ۲۱۱ صفحات ہیں۔ دو قلمی نسخے سنٹرل لائبریری پٹیالہ میں ہیں۔ چھپا ہوا نسخہ نابھوی کے پاس ہے۔ ایک قلمی نسخہ لاہور پبلک لائبریری میں ہے۔
۳	انشائے ہرکرن	ہرکرن ولد متھرا داس کنبوہ ملتانی	یہ کتاب سات ابواب میں منقسم ہے

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			پہلے میں وہ خطوط درج ہیں جو بادشاہوں نے بادشاہوں کو لکھے۔ کتاب تاریخی حیثیت سے بھی اہم ہے کیونکہ اس میں اس زمانے کے دفتری و منصب داری نظام کی جھلک نظر آتی ہے۔ انگریزوں کو فارسی انشا سکھانے کے لیے یہ کتاب منتخب کی گئی اور انگریزی ترجمے کے ساتھ ۱۷۸۱ء میں اسے کلکتے میں شایع کیا گیا۔ نابھوی کے پاس جو مطبوعہ نسخہ ہے وہ ۱۸۷۴ء میں چھپا۔ مطبع سلطانی واقع لاہور۔ ڈلمائی سائز۔
۴	انشائے بے نقاط	کامتا پرشاد ناداں	نولکشور پریس میں ۱۸۸۲ء میں چھپی۔ ڈلمائی سائز، ۱۲ صفحات۔ اس کے چار ایڈیشنوں کا پتہ چلا ہے۔ متروک النقاط ہے۔ ۳۷ مراسلات پر مشتمل ہے۔ نابھوی کے پاس ہے۔
۵	مرآۃ الخیال	میگھراج ملتانی	یہ تصنیف ایک فرضی داستان ہے جسے میگھراج نے اپنا کمال انشا اور قدرت کلام

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			دکھانے کے لیے لکھا تھا۔ مصنف کو اپنے کمال انشاپردازی پر ناز ہے۔ کتاب کا قلمی نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری مجموعۂ شیرانی میں شمارہ ۳۶۱۸ پر موجود ہے۔ کل ۱۳۹ ورق ہیں۔ ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے "پاکستان میں فارسی ادب" میں اسے انشائیوں میں درج کیا ہے۔
۶	رقعات منشی	کرپارام ملتانی	کرپارام ملتانی عہد شاہ عالم میں منشی کی حیثیت سے دبیر الدولہ کے ملازم تھے۔ اس مجموعہ سے اس زمانے کی انشاپردازی اور مکتوب نگاری کے اسالیب کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ خطوط میں عرضداشتیں ہیں۔ محمد شاہ کا عہدنامہ ہے۔ پنجاب یونیورسٹی لائبریری مجموعۂ شیرانی میں شمارہ ۱۱۷۰ پر نسخہ خطی موجود ہے۔
۷	۱۔ مراۃ الآداب ۲۔ شش جہت	روپ نرائن سیالکوٹی	مراۃ الآداب میں مذہبی احکام وضوابط درج ہیں۔ شش جہت کہانیوں کا مجموعہ ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
	۳۔ مخزن العرفان ۴۔ لغات جامع		مخزن العرفان میں برج کے علاقے کے تمام احوال و کوائف قلم بند کیے ہیں۔ آخر الذکر عربی۔ فارسی لغات ہے ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے "پاکستان میں فارسی ادب" میں اسے انشائیوں کے زمرہ میں شامل کیا ہے۔
۸	انشائے مادھورام	مادھورام	یہ ایک بہت مشہور کتاب ہے۔ ہر لائبریری میں اس کے نسخے دستیاب ہیں۔ راقم کے پاس بھی ہے۔ ۱۲۷۰ ہجری میں مطبع جعفری کانپور میں چھپی۔ یہ انشا گذشتہ صدی تک بطور نصاب پڑھائی جاتی رہی ہے۔
۹	وثیقہ یادگار فارسی	لالہ سالکرام صاحب	یہ سفرناموں اور رقعات پر مشتمل ہے۔ نول کشور پریس سے ۱۸۸۹ء میں چھپی۔ بڑے سائز کے ۵۰ صفحات ہیں۔ نابھوی کے پاس ہے۔
۱۰	روشن کلام	انشا بھوپت رائے	نابھوی کے پاس ہے۔ ۱۲۶۹ ہجری میں مطبع محمدی میں چھپی۔
۱۱	ارمغان پی	منشی دین دیال ریاست بھوپال	مطبع نظامی ۱۲۸۹، مکاتیب پر مشتمل ہے۔ ۵۰ صفحات ڈبل ہائی سائز۔ نابھوی کے پاس ہے۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۱۲	دستور الصبیان	منشی نوند رائے	مطبع نظامی۔ ۱۲۸ مکتوبات پر مشتمل ہے ۲۴۴ صفحات، ڈمائی سائز۔ یہ نصاب کے طور پر پڑھائی جاتی تھی۔ مشہور کتاب ہے کتبخانوں میں اس کے نسخے عام طور سے ملتے ہیں۔ ناجھوی کے پاس بھی ہے۔
۱۳	انشائے فارسی	حکم چند۔ دہلی	مکتوبات پر مشتمل ہے۔ ۱۸۶۶ء میں مطبع سرکاری لاہور میں چھپی۔ پنجابی یونیورسٹی پٹیالہ میں موجود ہے۔
۱۴	رقعات عجیب	سری کرشن دیوناتھ	مطبع ہند و پریس دہلی ۱۸۶۹ء۔ صفحات ۶۳ ڈمائی سائز۔ ناجھوی کے پاس ہے۔
۱۵	رقعات لچھمی نرائن	لچھمی نرائن	بہت مشہور کتاب ہے۔ ہر لائبریری میں ملتی ہے۔ ۱۲۶۰ ہجری میں مطبع رضوی میں چھپی۔ ۱۳۰ صفحات۔ بڑا سائز ہے۔ ناجھوی کے پاس ہے۔
۱۶		اجاگر چند الفت	الفت شاعری اور انشا میں دست خاص رکھتے تھے۔ رقعات بھی لکھے ہیں۔ انشا پردازی سے پختہ کاری نمایاں ہے دیکھئے عربی۔ فارسی اور علوم اسلامیہ میں بہار کا حصہ"۔ ادارہ

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
			تحقیقات عربی و فارسی پٹنہ۔ بہار۔
۱۷	دستور الانشا	رام نرائن موزوں	رقعات پر مشتمل ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے اس دور کے سیاسی۔ معاشرتی اور تمدنی حالات پر روشنی پڑتی ہے۔ یہ رقعات تاریخی اہمیت کے حامل ہیں دیکھیے "عربی۔ فارسی اور علوم اسلامیہ میں بہار کا حصہ"۔ ادارہ تحقیقات عربی۔ فارسی پٹنہ۔ بہار۔
۱۸	خلاصۃ التواریخ اور واردات قاسمی	کلیان سنگھ عاشق	سنہ پیدائش ۱۱۶۵ ہجری۔ دیکھیے "عربی۔ فارسی اور علوم اسلامیہ میں بہار کا حصہ"۔ ادارہ تحقیقات عربی۔ فارسی پٹنہ
۱۹	×	پیارے لال الفتی	شاعری اور انشا پردازی میں درجۂ امتیاز پر فائز تھے۔ دیکھئے شرح صدر
۲۰	منشات برہمن	چندر بھان برہمن	چندر بھان برہمن بہت نامور انشا پرداز ہیں۔ ان کی یہ تصنیفات مشہور ہیں۔ جو عام طور سے ملتی ہیں۔
۲۱	رقعات برہمن	"	
۲۲	انشا ہفت گلشن	"	
۲۳	چہار چمن۔		
۲۴	جامع الانشا	بھاگ چند	دیکھئے ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ از ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۷۱

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۲۵	خلاصۃ الانشا	سجان رائے یا سجان سنگھ دھیر	۱۱۰۲ ہجری } دیکھئے ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ از ڈاکٹر سید عبداللہ۔ ان دونوں کتابوں کے بارے میں ڈاکٹر ظہور الدین احمد نے پاکستان میں فارسی ادب کی تاریخ میں بوضاحت لکھا ہے۔
۲۶	خلاصۃ المکاتیب	سجان رائے یا سجان سنگھ دھیر	۱۱۱۰ ہجری
۲۷	شش جہت	روپ نرائن	۱۱۲۱ ہجری، دیکھئے ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ از ڈاکٹر سید عبداللہ۔
۲۸	ہفت انجمن	منشی اودھے راج	سات ابواب پر منقسم ہے۔ مراسلات، ذاتی خطوط ہیں۔
۲۹		ولی بنوالی داس	دیکھئے ادبیات فارسی میں ہندوؤں کا حصہ از ڈاکٹر سید عبداللہ صفحہ ۸۱
۳۰		لچھمی نرائن	بشرح صدر
۳۱		پنڈت دیا رام کاچرو خوشدل	دیکھئے کشمیر میں فارسی ادب کی تاریخ از پروفیسر عبدالقادر سروری صفحہ ۲۱۵
۳۲	دستور الانشا	نندلال منشی ملتانی	فہرست مخطوطات شیرانی جلد دوم صفحہ ۲۵۶
۳۳	دستور العمل	جواہر لال	بشرح صدر
۳۴	انشا	رائے کاشی رام	سکھ ریفرنس لائبریری امرتسر۔ گوردوارہ پربندھک کمیٹی

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۳۵	ارشاد الطالبین	ہرکرن کمبو ملتانی	قلمی نسخہ ہے بشرح صدر
۳۶	انشاء رام دیال		— بشرح صدر
۳۷		سجان رائے پوری بھٹنڈہ	قلمی نسخہ ہے۔ بشرح صدر
۳۸	عالمگیر انشائے فارسی	بدھا دامل کھتری	بشرح صدر
۳۹	انشائے دین دیال	دین دیال سرہندی	نمونہ ہائے انواع مختلف مکاتیب و خطوط، فہرست مخطوطات شیرانی جلد دوئم صفحہ ۳۴۲۔
۴۰	طراز انشا	منشی اندر جیت	تاریخ ادبیات مسلمانان پاکستان و ہند صفحہ ۲۳۰
۴۱	رقعات آنند رام	منشی آنند رام	" " صفحہ ۲۶۱
۴۲	انشائے تمیز	کالی رائے تمیز	" " صفحہ ۲۶۱
۴۳	انشائے شایق	منشی اجودھیا پرشاد	" " "
۴۴	انشائے دولت رام	منشی دولت رام	" " "
۴۵	انشائے دل کشا	منشی فتح چند	" " "
۴۶	انشائے لطیف	منشی ہیرا لال	" " "
۴۷	سلک مسلسل	منشی چندریکا پرشاد	" " "
۴۸	رقعات فیض آگیں	منشی نند کشور	" " "
۴۹	انشائے راحت جاں	جے سکھ رائے	" " صفحہ ۵۸۸
۵۰	انشائے روشن کلام		مکتوبہ جسونت رائے بسال ۱۲۵۳ فصلی/

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۵۱	انشائے مرصع دہبی	منشی ہرسہائے دہبی	۱۸۴۵ء ۔ فہرست مخطوطات شیرانی مکتوبہ چھیدی لال ۱۶ شوال ۱۲۱۷ ہجری ۱۸۰۲ء فہرست مخطوطات شیرانی ۔
۵۲	رسالہ انشا	سبحان سنگھ	فہرست مخطوطات شیرانی جلد دوم ص ۲۷۰
۵۳	مراۃ الانشا	منشی دربای لال کمبو	" " مکتوبہ ۱۱۷۸ ہجری
۵۴	مفید الانشا	لچھمی رام دہلوی	" ۱۲۲۴ ہجری
۵۵	نشات بال کرشن	بال کرشن برہمن حصاری	"
۵۶	منشات لچھمن سنگھ	لچھمن دہلوی	"
۵۷	منشات لچھمی رام		"
۵۸	انشائے بدیع	دین دیال لکھنوی	فہرست مخطوطات فارسی ایران و پاکستان جلد پنجم صفحہ ۲۴۹
۵۹	ملاحت مقال	دلیپ رائے	" صفحہ ۲۵۹
۶۰	نادر الانشا	راجہ ہرسہائے	" صفحہ ۲۰۰
۶۱	نادر الانشا	گردھاری لال	"
۶۲	مجمع الانشا	رایا راحت رائے	" صفحہ ۳۰۰
۶۳	نادر الانشا	کشناجی	" صفحہ ۳۴۲
۶۴	دستور العمل انشا	منشی ہرجس	" ۳۴۸ "
۶۵	انشائے موہن سنگھ		" ۳۴۹ "
۶۶	انشائے عطارد		" ۳۵۰ "

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۶۷	انشائے گیان چند		فہرست مخطوطات فارسی جلد پنجم ایران و پاکستان صفحہ ۳۶۲
۶۸	منشات بہار	رام داس منشی	" ۳۶۳ "
۶۹	مفید الانشا	لچھمی رام دہلوی	" ۳۷۷ "
۷۰	درجینز الانشا	بھوانی داس	" ۳۷۹ "
۷۱	منشات غیوری	لچھمن رام دہلوی	" ۳۸۰ "
۷۲	انشائے رایا دھرکول (؟)		" ۳۹۵ "
۷۳	انشائے دولت رائے		" ۴۰۷ "
۷۴	انشائے شیو نرائن		" ۴۲۲ "
۷۵	مجموعہ درد انشا	اندربھان سیالکوٹی	ایشیاٹک سوسائٹی مخطوطات فارسی ۴۰۰
۷۶	بہار معنی		" ۴۸۶ "
۷۷	خلاصۃ الانشا	لچھمی رام دہلوی	" ۱۶۳ "
۷۸	انشائے گوبند نرائن	منشی گوبند نرائن	فارسی زبان و ادب کے لیے غیر مسلم حضرات کی خدمات ۔ عربک اینڈ پرشین انسٹی ٹیوٹ راجستھان صفحہ ۲۶
۷۹	میزان تاریخ	موہن لال جائسی کائستھ	نسخہ ہائے خطی کراچی پاکستان و ایران صفحہ ۴۵۶
۸۰		منشی رگھپت رائے	نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان و ایران جلد پنجم صفحہ ۱۰
۸۱	ترتیب الانشا/بدیع الانشا	منشی نواب شایستہ خاں (؟)	" "

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۸۲	انشائے مفید	لکشمی رام	نسخہ ہائے خطی فارسی پاکستان و ایران جلد پنجم صفحہ ۱۱۲
۸۳	منشات منشی گنیش داس		فارسی مخطوطات شیرانی جلد دوم صفحہ ۳۷۷
۸۴	نامۂ نگارین و صحیفۂ رنگین	سیالکوٹی مل وارستہ	مجموعہ منشات و نگارشات مخطوطات شیرانی جلد دوم صفحہ ۳۷۸ مکتوبہ ۱۲۳۶ ہجری
۸۵	انشائے بال بہاری		فارسی مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی فارسی و عربی صفحہ ۸۹ کتابت ۱۲۲۴ نمبر ۷۸۳
۸۶	انشائے بال بہاری	الگ ہے۔	فارسی مخطوطات انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی فارسی و عربی صفحہ ۸۹ کتابت ۱۲۲۴ نمبر ۷۸۴
۸۷	انشائے سجان رائے		مخطوطات فارسی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی فارسی و عربی۔ صفحہ ۳۰۰ کتابت ۱۲۸۵
۸۸	انشائے سلطانی مل		مخطوطات فارسی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی فارسی و عربی سلطانی مل کاتب کتابت ۱۲۳۳
۸۹	انشائے ہرجس رائے		مخطوطات فارسی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی فارسی و عربی کاتب ہندو کتابت ۱۸۸۰
۹۰	منشات بہار	رائے رام سرن داس منشی	مخطوطات فارسی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی فارسی و عربی۔ کتابت ۱۲۳۵ صفحہ ۲۴۸

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۹۱	نادر انشا	کشا جی پنڈت	مخطوطات فارسی انجمن ترقی اردو پاکستان کراچی فارسی و عربی ۸۸ ۱۱ تصنیف صفحہ ۱۹
۹۲	منشات راجہ لچھمن لال لچھمن		تذکرہ مخطوطات حیدرآباد۔ قادری زور۔ جلد چہارم صفحہ ۲۱۰
۹۳	انشائے فارسی	تلسی رام منشی	صفحہ ۴۲۵
۹۴	گلزار شفیق	حکومت رائے شاگرد لچھمن نرائن شفیق	تذکرہ مخطوطات پاکستان و ایران جلد دوم صفحہ ۸۷
۹۵	انشائے بدایع	دین دیال فتحپور	ایشیاٹک سوسائٹی۔ کلکتہ فہرست مخطوطات صفحہ ۴۷۲
۹۶	نامہ ہائے راجہ دینا ناتھ		فہرست مخطوطات فارسی پاکستان و ایران جلد پنجم صفحہ ۴۲۹۔
۹۷	انشائے بھگوانداس		صفحہ ۴۳۰
۹۸	انشائے تمیز		فہرست خطی فارسی پاکستان و ایران صفحہ ۴۳۱
۹۹	جواہر المتاثرہ (؟)	خیالی رام لکھنوی	" ۴۳۸/۴۳۹
۱۰۰	انشائے دلکشا	مہابیر پرشاد	" ۴۷۲
۱۰۱	انشائے ذیل	ذیل سنگھ کشمیری	" ۴۷۲
۱۰۲	انشائے رنگین	نیک لال	فہرست ولیم کالج " ۵۵
۱۰۳	انشائے فارسی	منشی حکم چند	فہرست خطی فارسی پاکستان و ایران جلد پنجم " ۴۴۰

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۱۰۴	انشائے کاشی پرشاد ناداں بے نقاط	کاشی پرشاد ناداں	فہرست خطی فارسی پاکستان و ایران جلد پنجم صفحہ ۴۰۶
۱۰۵	انشائے روشن کلام	جسونت رائے	فہرست خطی فارسی پاکستان و ایران جلد پنجم صفحہ ۴۸۴
۱۰۶	دستورالانشا	نندلال منشی	،، ،، ۴۸۶
۱۰۷	مراۃ الانشا	درباری مل کمبو	،، ،، ۵۰۸
۱۰۸	منشات بال کرشن	بال کرشن حصاری	،، ،، ۵۱۱
۱۰۹	منشات لچھمی رام	لچھمی رام پنڈت دہلوی	،، ،، ۵۱۱
۱۱۰	انشائے مرصع دہبی	منشی ظاہر سہائے دہبی	،، ،، ۳۳۰
۱۱۱	بہارستان معنی	پرتاپ رام	مراۃ العلوم ۔ مرتبہ خاں بہادر مولوی عبدالمقتدر ۔ فہرست نسخ خطی فارسی۔ ۱۹۲۵ء اورنٹیل پبلک لائبریری بانکی پور ۱۲۱ اوراق۔
۱۱۲	رقعات منشی	منشی المعروف بہ ملک زادہ	ایضاً ۱۲۹۵ اوراق ۔ رقعات مصنف مع فرامین وغیرہ
۱۱۳	،،	،،	مراۃ العلوم ۔ مرتبہ خاں بہادر مولوی عبدالمقتدر ۔ فہرست نسخ خطی فارسی ۱۹۲۵ء اورنٹیل پبلک لائبریری بانکی پور ۱۳ اوراق ۔ چند رقعات مع القاب وآداب۔

نمبر شمار	نام کتاب	نام مصنف	کیفیت
۱۱۴	رقعات	المنشی المعروف بہ ملک زادہ	مراۃ العلوم مرتبہ خاں بہادر مولوی عبدالمقتدر ۔ فہرست نسخ خطی فارسی ۱۹۲۵ء اورنٹیل پبلک لائبریری بانکی پور ۳۹ اوراق ۔ رقعات بنام احباب وغیرہ ۔
۱۱۵	طلسمات خیال	لالہ کیول رام	مراۃ العلوم ۔ مرتبہ خاں بہادر مولوی عبدالمقتدر فہرست نسخ خطی فارسی ۱۹۲۵ء اورنٹیل پبلک لائبریری بانکی پور رقعات بنام شاہ عالم
۱۱۶	گلدستہ سخن	خوب پرکاش	مراۃ العلوم ۔ مرتبہ خاں بہادر مولوی عبدالمقتدر ۔ فہرست نسخ خطی فارسی ۱۹۲۵ء اورنٹیل پبلک لائبریری بانکی پور ۴ع ۴ع ۲ صفحات
۱۱۷	منشورات آنند رام	آنند رام مخلص	مراۃ العلوم ۔ مرتبہ خاں بہادر مولوی عبدالمقتدر فہرست نسخ خطی فارسی ۱۹۲۵ء اورنٹیل لائبریری بانکی پور ۔ رقعات ۔
۱۱۸	نوادر الجامع	مہتاب رائے	بشرح صدر

یہ بات مدنظر رہے کہ اگر کوئی نسخہ دو مختلف جگہوں پر تھی درج ملا تو دونوں درج کردیئے گئے ہیں تاکہ تلاش کرنے میں آسانی ہو۔

آثار علمیہ وادبیہ

مکاتیب مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی بنام شیخ نذیر حسین صاحب لاہور

مئو

۱۵ ربیع الثانی ۹۹ھ / ۱۵ مارچ ۷۹ء

مکرم و محترم !   السلام علیکم

آپ کے دو عنایت نامے ایک ہی ساتھ ملے، قند مکرر کا لطف حاصل ہوا۔ مسٹر صباح الدین عبد الرحمٰن نے آپ کا سلام ایک دفعہ بھی نہیں پہونچایا، جلد ہی وہ ملے تھے، تو میں نے شکایت کی، اردو انسائیکلو پیڈیا کے لیے میں اپنے ایک بنارسی کرم فرما کو لکھ رہا ہوں وہ آج کل کراچی میں ہیں، وہ اگر اسلم صاحب کے پاس رقم بھجوا دیں تو آپ کسی صورت سے انہیں کے ہاتھ اس کی کل جلدیں بھجوانے کی زحمت فرمائیں، بھیجنے کے بعد وہ آپ کو مطلع کریں گے اور لاہور سے گزرنے کی تاریخ اور وقت متعین طور پر بتائیں گے۔

میمن صاحب کی کتابوں کے لیے انشاء اللہ مصر کسی شناسا کو لکھوں گا۔

حلب سے میرے ایک شاگرد عبد الوہاب زاہد ہندی کئی سال سے حلب بلا رہے تھے، میری روانگی سے ڈھائی سال پہلے ہوائی جہاز کا ٹکٹ بھی بھیج دیا تھا، مگر جس وقت ٹکٹ آیا تھا، عین اسی وقت مجھے ہارٹ اٹیک ہوگیا تھا، صحتیاب ہونے کے بعد بھی یہ سفر زیادہ تر احتیاط کے پیش نظر ٹلتا رہا، میں ستمبر میں جمعیۃ العلماء کی ورکنگ کمیٹی میں شرکت کے لیے دہلی گیا ہوا تھا تو جی میں آیا کہ لاؤ ویزا حاصل کرنے کی دوبارہ کوشش کر دوں، اس لیے کہ ایک بار ویزا کی معیاد گزر چکی تھی،

بہر حال مہربانوں نے بہت دوڑ دھوپ کی تو ویزا مل گیا، جس دن ویزا ملا اسی دن سیرین ایرلائنس کے ہوائی جہاز کی روانگی بھی تھی، کوشش کرتے کراتے کسی طرح جگہ مل گئی اور میں دفعتاً بلا اطلاع دمشق کے لیے روانہ ہوگیا، سفر کا مقصد میری طرف سے "نقادات علمیہ" اور چند مخطوطات کی جستجو اور اگر امکان ہو تو ان کو حاصل کرنے کی کوشش کے سوا اور کوئی چیز نہیں تھی، ویسے جانے پر حلب کے علاوہ دمشق، حمص اور حما کے بکثرت علماء نے حدیث کی سند اور اجازہ حاصل کیا، دو تین مجلسوں میں مختصر سے خطاب کی بھی نوبت آئی، زیادہ تر مشغولیت کتبخانہ احمدیہ میں رہی، چند عالموں نے اپنے مؤلفات سنا کر یا دکھا کر تقریظ و تصویب بھی کرائی۔

میں حلب سے دلائل النبوۃ للبیہقی کا فوٹو اور ذہبی کی دو تصنیفوں کا بھی فوٹو لایا ہوں، ان کے علاوہ اور بھی دو تین چیزوں کا عکس حاصل کیا ہے، مطبوعات میں المعجم المفہرس اور البدر الطالع تفسیر ابن جریر اور تفسیر در منثور وغیرہ بہت ساری کتابیں خرید کر لایا ہوں۔

کئی سال پہلے جب میں بیروت گیا تھا۔ اس وقت مؤسسۃ الرسالہ نے زوائد مسند بزار" کی پہلی جلد چھاپنے کے لیے مجھ سے لی تھی، مگر مکافاہ ادا نہیں کیا تھا، اور دوسری جلد کے لیے برسوں سے ان کا تقاضا تھا، اس موقع کو غنیمت سمجھ کر میں اس کی دوسری جلد بھی لیتا گیا تھا، اور پہلی جلد بے حد غلط چھپی تھی، اسکا مصحح نسخہ بھی لیتا گیا تھا، انھوں نے خود ہی لکھا تھا کہ آپ تصحیح کر دیں تو ہم دوبارہ چھاپیں گے، دوسری جلد کی طباعت شروع کرنے کے لیے بھی سخت تاکید کر آیا تھا،

مگر شاید اب تک طباعت شروع نہیں ہوئی، اس کی تصحیح پر بھی کسی جید الاستعداد
اور صاحبِ صلاحیت عالم کو لگانا تھا، تاکہ دوسری جلد کا بھی حشر پہلی کا سا نہ
الحمد للہ کہ یہ کام بھی ہو گیا۔

میں نے طیبی شرح مشکوٰۃ کے مختلف نسخوں پر سرسری نظر ڈالی ہے، اس
کا اہتمام مولانا عبد الرؤف عالی (دیوبند) کر رہے تھے اور تصحیح میں مجھ سے بھی
مدد لینا چاہتے تھے، اب معلوم نہیں وہ کس مرحلہ میں ہے۔

بستان المحدثین جیسی کتاب کی واقعی بہت ضرورت ہے، مگر اس کے لیے فرصت
کہاں سے لائی جائے، مصنف عبد الرزاق کے مقدمہ کی طلب ہر طرف سے ہے، اس
زوائد مسند بزار پر نظرِ ثانی سے پہلے میں اس کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتا۔

مجھے تو کبھی اس کا خیال نہیں ہوا تھا، مگر آپ ضرورت سمجھتے ہیں اور حکم دیتے
ہیں تو انشاء اللہ زوائد کے آخر میں اپنا مختصر ترجمہ دیدوں گا۔

فواد سیزگین سے میری ملاقات نہیں ہے، مگر ان کی مجاز القرآن میں نے دیکھی
تھی اور التراث العربی کا بھی شہرہ بہت سن رہا ہوں، زرکلی کی الاعلام ہمارے
مدرسہ کے کتب خانہ میں میری ہی منگوائی ہوئی ہے، اور زرکلی سے بیروت میں
بار مل بھی چکا ہوں، معجم المولفین بھی دیکھی ہے، صاحبزادہ کے لیے بدل وجان دعا
کرتا ہوں، اللھم اشفہ انت الشافی لا شفاء الا شفاءك شفاء لا یغادر
سقما، — انشاء اللہ پھر آئندہ، والسلام حبیب الرحمٰن اعظمی

(۲)

مئو ناتھ بھنجن

مکرم جناب شیخ نذیر حسین صاحب حفظہ اللہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کے خط مورخہ ۷ر ۷ر ۸۲ء کا جواب میں نے دیدیا تھا، المعارف لاہور
کا کوئی پرچہ مجھے نہیں ملا۔ میں نے آپ کے بچے کی شفایابی کے لیے جہاں تک یاد ہے
دعا کی تھی اور اب بھی کرتا ہوں، مصنف ابن ابی شیبہ کی پہلی جلد مکتبۂ امدادیہ
مدینہ منورہ سے شایع ہو چکی ہے میرے لیے ایک نسخہ لکھنؤ میں آکر رکھا ہوا ہے۔

ایک مصری طالب علم نے امریکہ آنے کی دعوت دی تھی مگر میں اپنی مشغولیت
اور اپنے عوارض اور جس کام کے لیے بلا وا تھا اس کی طوالت اور ثقل کی وجہ سے
عذر کر دیا۔ دوسرا خط مورخہ ۷ر مارچ ۸۳ء جب سے آیا ہے اس وقت سے
اب تک میری طبیعت ہموار نہیں ہے، کئی سفروں کو ملتوی کر چکا ہوں، اردن کا
ٹکٹ آکر رکھا ہوا ہے مگر ناسازیٔ طبع کی وجہ سے نکلنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے
یہی وجہ پاکستان نہ آنے کی بھی ہے۔ عبد الرحمٰن صاحب کو ندوہ کے خطوط ملے انکے
جوابات بھی لکھوا دیے گئے، انھوں نے آپ کے لیے حزب الاعظم کی نشاندھی
کا ذکر بھی کیا ہے، نصرۃ الحدیث کی دوبارہ طباعت اب تک نہیں ہو سکی،
رہبر حجاج کی دوبارہ کتابت ہو رہی ہے زوائد مسند بزار کا تیسرا حصہ (جلد ثالث)
کا مسودہ مع تعلیقات عمان (اردن) روانہ ہو چکا ہے، المعہد العالی کا نصاب تعلیم
چھپنے کو گیا ہے۔ مولوی رشید احمد اور ان کے چھوٹے بھائی مولوی سعید احمد سلام
کہتے ہیں، خطوط جلد لکھیں تو کرم ہو گا۔ والسلام حبیب الرحمٰن

اردو انسائیکلو پیڈیا کی کیا قیمت ہے۔ بنارس کا ایک خاندان کراچی میں ہے،

قیمت معلوم ہو جائے تو میں بنارس میں جمع کر کے کراچی والوں کو لکھوں کہ وہ آپ کے پاس قیمت پہونچا دیں، کتاب آپ بھیجیں یا وہ خود بھیجدیں۔

(۳۴)

مکرم و محترم شیخ نذیر حسین صاحب !

السلام علیکم و رحمۃ اللہ۔ آپ کا گرامی نامہ ملا، بڑی خوشی ہوئی، میں اسکے لیے چشم براہ تھا، پاکستان کے دوسرے بزرگوں کا بھی ادھر کوئی خط نہیں آیا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ مجھے بھول گئے۔ آپ کی یاد برابر آتی رہتی ہے، مگر پیرانہ سالی میں کاموں کے بھر مار کی وجہ سے عاجز ہوں۔

(۱) "المطالب العالیہ للحافظ ابن حجر" کے تین، چار باسند نسخوں سے ایک صحیح نسخہ اپنی تعلیقات کے ساتھ تیار کر رہا ہوں۔

(۲) "مصنف ابن ابی شیبہ" کی تحقیق و تعلیق کا کام مطبوعہ بمبئی گیارہویں جلد تک پہونچ چکا ہے، آج کل کتاب لفرائض چل رہی ہے۔

(۳) اپنی غیر مطبوعہ نرالی کتاب کے مسودہ کی تبییض کرا رہا ہوں، اسکے بعد اس کا دوسرا نسخہ حروف ہجا کی کامل ترتیب پر تیار کرانے کا منصوبہ ہے دعا کیجئے کہ یہ سب منصوبے پورے ہو جائیں۔

(۴) اس کے علاوہ میں روزانہ خطوط یا استفسارات کے جوابات لکھتا ہوں۔

(۵) مدرسہ کے ہر شعبہ کے انتظام کی ذمہ داری۔

(۶) ان کے علاوہ مختلف امور جیسے کسی مدرسہ میں بخاری شریف ختم کرانا، کسی مدرسہ یا مسجد کا سنگ بنیاد رکھنا، بعض مدارس کی سرپرستی، مدارس کے

سالانہ جلسوں میں صدارت یا صرف حاضری وغیرہ۔

ادھر تقریباً ایک ماہ سے کمر اور دونوں رانوں کے اعصاب میں اٹھنے اور بیٹھنے کے وقت اتنا کھچاؤ پیدا ہوتا ہے کہ بعض اوقات گرنے کا اندیشہ ہو جاتا ہے اس لیے کسی سنبھالنے والے کی ہر وقت حاجت رہتی ہے، اس نئی پریشانی کیوجہ سے نیز بعض دوسرے عوارض کی وجہ سے سفر کرنے میں زحمتیں پیش آتی ہیں، اس شکایت کو چھوڑ کر الحمد للہ حق تعالیٰ کا بڑا فضل و کرم ہے کہ میں صحت و عافیت کی نعمت سے متمتع ہوں اور علمی کام برابر جاری ہے، اس احسان کا شکر ادا کرنے سے واللہ العظیم میں قاصر ہوں۔

"غریب الحدیث لابن قتیبہ" "غریب الحدیث للخطابی" میرے پاس پہونچ گئی ہے، ابن الجوزی کی کتاب ابھی نہیں آئی، "دلائل النبوۃ" اور "مصابیح السنۃ" دونوں کہاں چھپی ہیں، پتہ معلوم ہو تو کسی پاکستانی محسن کو خط لکھوں۔ تفسیر معالم التنزیل ہندوستان میں بڑی تقطیع پر شایع ہوئی تھی مگر میرے کتب خانہ میں نہیں ہے۔ "مظاہر حق" دیوبند میں آج کل کی زبان میں چھپ رہی تھی اسکی کئی قسطیں میں نے دیوبند میں دیکھی تھی، جہانتک مجھے یاد ہے کہ یہ کارنامہ عبدالروف عالی کا تھا مصنف ابن ابی شیبہ کے باب میں کہا جاتا ہے کہ اس کی پانچویں جلد چھپ چکی ہے مگر اس کا کوئی نسخہ میرے پاس نہیں آیا ہے۔

اب میں تھک گیا، انشاء اللہ پھر ملوں گا، آپ بھی میرے خط کا جواب فوراً عنایت فرمائیں۔

(باقی)

اخبار علمیہ

پاکستان کے ادارہ نیشنل ہجرہ کائونسل نے پندرہویں صدی ہجری کی مناسبت سے علوم اسلامیہ کی سّو بلند پایہ، منفرد اور زندہ جاوید کتابوں کو انگریزی ترجمہ کے ساتھ شایع کرنے کا منصوبہ بنایا تھا اس سلسلہ میں خوارزمی کی کتاب 'الجبرا' کی اشاعت کی خبر ملی تھی اب معلوم ہوا ہے کہ کونسل نے ترکی کے ایک علمی ادارہ اتاترک کلچرل سنٹر کے اشتراک و تعاون سے علامہ شمس الدین شیروانی کے رسالہ تشریح ابدان کا اصل ترکی متن انگریزی ترجمہ کے ساتھ سات مخطوطات سے مقابلہ اور تصحیح کے بعد شایع کیا ہے، جب علامہ شیروانی کو حرمین شریفین کا قاضی مقرر کیا گیا تو انھوں نے بطور تشکر یہ کتاب لکھ کر سلطان مراد چہارم کو ۱۶۳۲ء میں نذر کی تھی یہ طب اسلامی کا بہترین نمونہ ہونے کے علاوہ اس میں یورپ کی طب جدید کے ابتدائی دور کے اثرات بھی ہیں جن سے اس کی اہمیت دوچند ہوگئی ہے، انگریزی ترجمہ ترکی کے ایک فاضل DR. ESIN KAHYA کے قلم سے ہے جنھوں نے پیش لفظ میں موضوع کتاب کی اہمیت کے علاوہ ترکی زبان میں عربی و فارسی اصطلاحات کے اثر و نفوذ کی نشاندہی کی ہے، کونسل کے سربراہ سید شریف الدین پیرزادہ کا مقدمہ بھی محققانہ اور پُر از معلومات ہے۔

کوالالمپور ملیشیا سے یہ خوش اثر خبر ملی کہ وہاں کے ایک ادارہ اسلامک بک ٹرسٹ نے مولانا ابوالکلام آزادؒ کی تفسیر سورہ فاتحہ کا انگریزی ترجمہ بڑے

اہتمام سے شایع کیا ہے، ترجمہ کی سعادت ڈاکٹر سید عبداللطیف کو حاصل ہوئی۔

ادھر خلافت عثمانیہ کا چرچا اور اس کی یاد کا سلسلہ روز افزوں ہے، دولت عثمانیہ کے عروج و زوال اور اس کے کارناموں کے جائزہ کے لیے ترکی کے علاوہ دوسرے اسلامی ملکوں میں بھی بعض اہم ادارے سرگرم عمل ہوگئے ہیں، عالم عرب کی دو علمی انجمنوں 'سنٹر فار اوٹومن اینڈ موریسکن اسٹڈیز: ڈکومینٹیشن اینڈ انفارمیشن (CEROMODI) اور عرب کمیٹی فار اوٹومن اسٹڈیز (ACOS) کے نام اس سلسلہ میں قابل ذکر ہیں، ان کی جانب سے حال ہی میں تیونس میں ایک سمپوزیم "خلافت عثمانیہ کے دور میں بلاد عرب، تاریخی عناصر اور بحیرہ احمر" کے موضوع پر ہوا، عرب علماء و محققین کے علاوہ ترکی اور یورپ کے فضلاء نے بھی اس میں شرکت کی، تقریباً ۵۲ مقالات پڑھے گئے، چند اہم مقالوں کے عنوان اس طرح ہیں، 'فقہاء اور اسلامی شہر' 'ترکی کے آثار قدیمہ اور تازہ تحقیقات' یروشلم میں اہم عمارتوں کی بحالی اور تعمیرات نو کی تہذیبی و سماجی اساس' 'انیسویں صدی کے نصف آخر میں بحیرہ احمر میں مصری اور یورپی ساحلی تنصیبات' 'تیونس کی جغرافیائی تاریخ اور مالگزاری کا اندراج' وغیرہ ان تمام مقالات کو عنقریب کتابی شکل میں شایع کرنے کا منصوبہ ہے۔

آل عثمان کے حکمرانوں کی فراخ دلی اور رواداری کی مثالیں بھی دوسرے اسلامی فرمانرواؤں کی طرح دلکش اور سبق آموز ہیں، کبھی کبھی اس کی شہادت اغیار کے قلم سے بھی ہوجاتی ہے، ۱۴۵۳ء میں سلطان محمد فاتح نے قسطنطنیہ کو فتح کرکے ازمنہ وسطیٰ کے ایک باب کو ہمیشہ کے لیے بند کردیا اور پھر تین سال کے بعد وہ یونان

کی راجدھانی ایتھنز میں فاتحانہ داخل ہوا، قدیم ترین انسانی تہذیب کی نمائندۂ یونان کی یہ راجدھانی چار صدیوں تک خلافت عثمانیہ کے زیر نگیں رہی لیکن بجز چند مسجدوں کی تعمیر کے ترک مسلمانوں نے گرجاؤں اور یونانی معابد کے اس شہر کے چہرہ کو کہیں سے بدلنے کی کوشش نہیں کی، لاطینی اور دوسرے یوروپی قابضوں کی چیرہ دستیوں کی آماجگاہ ایتھنز کے لیے رواداری اور وسعت قلبی کا یہ مظاہرہ واقعتاً انوکھا اور ناقابل یقین تھا، ترکی دور کے ایتھنز کی اس چار سو سالہ تاریخ اسلامی کی بعض فراموش شدہ داستانوں کو ایک مستشرق مولی میکنزی نے اپنی کتاب "ٹرکش ایتھنز، دی فارگوٹن سنچریز" میں پھر سے زندہ کر دیا ہے۔

———— • ————

علوم اسلامیہ سے تعلق و شغف اور بعض جدید علمی تحقیقات کے سلسلہ میں جاپان کے چند اداروں کی سرگرمیوں کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے، اب اس میں تازہ اضافہ کیوٹو کے انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کی نئی کتاب "اسلامک آرکی ٹیکچر اینڈ جاپانی آرکی ٹیکچر" ہے، تعمیرات کی ظاہری شکل و ہیئت میں اُس طرز تعمیر کا اثر کس درجہ کارفرما ہوتا ہے اور اس سے مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کے خط و خال کس طرح جدا اور متمیز ہوتے ہیں، ان دلچسپ سوالوں کا جواب اس کتاب میں نہایت مدلل طور پر تلاش کیا گیا ہے۔ مصنف کے نزدیک انسان کے روحانی عقائد اور عقلی نظریات کا فرق اس کے طرز تعمیر میں ظاہر ہو کر رہتا ہے اور اس سے زمان و مکان کے فرق اور بنی نوع انسان کے ذہنی و فکری اختلاف کو سمجھنے میں بھی بڑی مدد ملتی ہے، چنانچہ مصنف نے اسلام، بدھ مت، تاؤازم مذہب کنفیوشس اور شنتوازم کے فن تعمیر کے بنیادی اصولوں کو واضح کرنے کے بعد تاریخ کے بعض اہم طرز ہائے تعمیر کے ناگزیر تصورات پر بحث کی ہے اور پھر اسلامی اور جاپانی فن تعمیر کا جائزہ اسی پس منظر میں لیا ہے، مسجدوں، مندروں اور دوسری عبادت گاہوں کی تعمیراتی اہمیت کے باب میں یہ سوال بھی قائم کیا ہے کہ مسجدیں عموماً شہر کے قلب میں کیوں واقع ہوتی ہیں جب کہ دوسری عبادت گاہیں عام طور پر آبادی کے کنارے ہوتی ہیں، صحن و دالان، مساجد کا لازمی جزو کیوں ہیں اور دوسرے عبادت خانوں میں صحن کا تصور کیوں نہیں ہے ۲۵۵ صفحات کی اس کتاب کے مصنف M USALLAM SAKKA AMINI ہیں اور اسے کیوٹو انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی کے ڈپارٹمنٹ آف آرکی ٹیکچر سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

———— • ————

مساجد کے باب میں ان دنوں بابری مسجد کا ذکر صرف ہندوستان ہی نہیں، بیرونی ممالک میں بھی موضوع بحث ہے، چنانچہ پیرس میں یونیسکو کے ایک اہم اجتماع میں مسجد اقصیٰ اور مسجد ٹوکیو کے ساتھ بابری مسجد کا قضیہ بھی زیر بحث رہا اور اقوام متحدہ کے اس ادارہ نے اس کے انہدام کے عزائم اور تیاریوں پر سخت تشویش کا اظہار کیا۔

———— • ————

(ع۔ص)

مطبوعاتِ جدیدہ

قرآن حکیم اور علم نباتات از جناب مولانا محمد شہاب الدین ندوی، متوسط تقطیع
بہترین کاغذ، کتابت و طباعت، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۲۴۴ قیمت ۱۰۰ روپیے
پتہ: فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، ۱۶۵، دائرہ دہلی، بنگلور، ۵۶۰۰۵۷

زیر نظر کتاب میں مولانا محمد شہاب الدین ندوی نے قرآن مجید اور سائنس کے باہمی ربط و تعلق پر بحث کی ہے جو عرصہ سے ان کی دلچسپی کا موضوع ہے، یہ دراصل ان کا ایک طویل مقالہ تھا جو ماہنامہ برہان میں بہت پہلے بالاقساط شایع ہوا تھا اور اب مزید اضافہ کے بعد کتابی صورت میں شایع کیا گیا ہے، کتاب کا مرکزی موضوع سبزہ یا کلوروفل کے متعلق آیات قرآنی سے سائنس کے بعض حیرت انگیز انکشافات کی تطبیق ہے، مصنف سائنس کو دین کا مخالف نہیں سمجھتے بلکہ اس کی تائید و تقویت کا ذریعہ خیال کرتے ہیں، ان کے نزدیک قرآن مجید سائنس کے بجائے مادیت، الحاد، دہریت اور کفر و شرک کے رد و ابطال کے لیے نازل ہوا ہے، کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں قرآن مجید کی روشنی میں سائنس کے حدود و ضوابط پر اظہار خیال کیا گیا ہے، دوسرے باب میں علم نباتات سے علمائے اسلام کے شغف و اعتنا کا ذکر ہے، تیسرے اور چوتھے باب میں سبزہ (کلوروفل) کی اصل بحث ہے بعد کے ابواب میں وجود باری اور حیات بعد الموت کے متعلق بحث ہے، تخلیق و ربوبیت الٰہی کا اثبات اس کتاب کی اصل روح ہے، نیز اس میں جدید

سائنسی تحقیقات کے پس منظر بعض قرآنی الفاظ قدر، مقدار، موزوں وغیرہ کی دلکش تشریح کی گئی ہے، البتہ اپنے ہی قلم سے اپنی کتاب کو "جدید علم کلام کا نمونہ" اور "جدید کلامی نقطہ نظر سے پوری نوع انسانی کے لیے حجت" اور "جدید علم کلام کے نقطہ نظر سے ایک مکمل فلسفہ" وغیرہ لکھنا غیر مناسب اور فخر و تعلی اور خود ستائی ہے، آخر میں مختلف النوع فہرستیں بھی درج ہیں۔

کبیر احمد جائسی کی علمی و ادبی خدمات مرتبہ جناب شہاب الدین، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و کتابت و طباعت، مجلد مع خوبصورت گرد پوش، صفحات ۲۴۳ قیمت ۱۰۰ روپیے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس اے ایم یو مارکیٹ، علی گڑھ

پروفیسر کبیر احمد جائسی اردو کے لائق اہل قلم اور اچھے مترجم ہیں، ایک عرصہ تک انھوں نے شاعری کے چمن زاروں کی سیر کی اور یحییٰ اعظمی اور علامہ اقبال سہیل کے سلسلہ تلمذ سے وابستہ رہے، فارسی اور تاجیکی ادب پر ان کی خاص نظر ہے، فانی اور اقبال کے متعلق ان کی نگارشات پسند کی گئیں، وہ شبلی کالج کے طالب علم تھے اور ان کے بچپن اور نوجوانی کی زندگی دارالمصنفین کے علمی و ادبی ماحول میں گزری اور مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم نے انہیں شعر و ادب کے نکتے بتائے جن سے ان کا خاص ربط و تعلق تھا، زیر نظر کتاب میں ان کی تحریری کاوشوں پر مختلف ادیبوں اور نقادوں کے منتخب مضامین کو لائق مرتب نے سلیقہ سے پیش کیا ہے، ڈاکٹر ابن فرید کے تاثراتی مضمون سے جائسی صاحب کی زندگی اور شخصیت اور کردار کی خوبی اور عظمت کا پتہ چلتا ہے۔

کاوش از جناب امتیاز احمد، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ، کتابت و طباعت

بہتر، مجلد مع گرد پوش، صفحات ۴۴۴، قیمت ۳۰۰ روپیے، پتہ: ایجوکیشنل بک ہاؤس یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ۔

یہ آٹھ مضامین کا مجموعہ ہے، اس میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن، رشید احمد صدیقی، اختر انصاری، کلیم الدین احمد، معین احسن جذبی اور یدوین شاکر کی شخصیت کے بعض علمی و ادبی خط و خال نمایاں کیے گئے ہیں۔ اول الذکر کی حیات اور علمی خدمات پر مفصل مضمون ہے اس میں معارف میں شایع ہونے والے ان کے تمام مضامین کی فہرست بھی دی گئی ہے، جس میں جون ۱۹۷۹ء کے معارف کے ایک مضمون 'ارجنٹائنا کے مسلمان' کو بھی غلطی سے ان سے منسوب کر دیا گیا ہے، پہلا مضمون سرسید مرحوم کی سائنٹفک سوسائٹی پر ہے اور سیر حاصل ہے، لایق مصنف کی یہ پہلی کاوش ہے لیکن ذہن و قلم کے اعتدال و توازن سے ان کی پختگی و مشاقی جھلکتی ہے۔

تحفۃ الہند تصحیح جناب ڈاکٹر نور الحسن انصاری، متوسط تقطیع، صفحات حصہ اول ۱۲۵ حصہ دوم ۲۵۵ قیمت بالترتیب ۳۰، ۵۵ روپیے، پتہ: شعبۂ فارسی، دہلی یونیورسٹی دہلی۔

عہد عالمگیری کے ایک فاضل میرزا خاں ابن فخر الدین محمد نے ہندوستانی عروض، قافیہ، بدیع، موسیقی وغیرہ علوم کے متعلق ایک عمدہ کتاب تحفۃ الہند کے نام سے لکھی تھی جسکا تعارف سب سے پہلے مولانا شبلی مرحوم نے ۱۹۱۱ء کے الندوہ میں کرایا تھا، اس کتاب میں ہندی زبان کے قواعد و الفاظ کے ضمن میں بعض ہندی الفاظ کی تشریح فارسی زبان میں کی تھی، اس اہم تالیف کے مخطوطے بوڈلین لائبریری اور انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں، دہلی یونیورسٹی کے فاضل استاد ڈاکٹر نور الحسن انصاری مرحوم نے ان نسخوں کی مدد سے ہندی الفاظ کی تشریح کے باب کو مفید اور ضروری حواشی کیساتھ تصحیح کے بعد مجلہ تحقیقات فارسی کے خاص شمارہ کی حیثیت سے شایع کیا تھا جو گویا ہندی فارسی فرہنگ ہے ہندی فارسی ادبیات کے قدردانوں کیلئے یہ ایک قیمتی تحفہ ہے۔

(ع۔ ص)